BOOK HOME
مطالعۂ قابل
قابل اجمیری — زندگی اور شاعری
وحید الرحمٰن خان
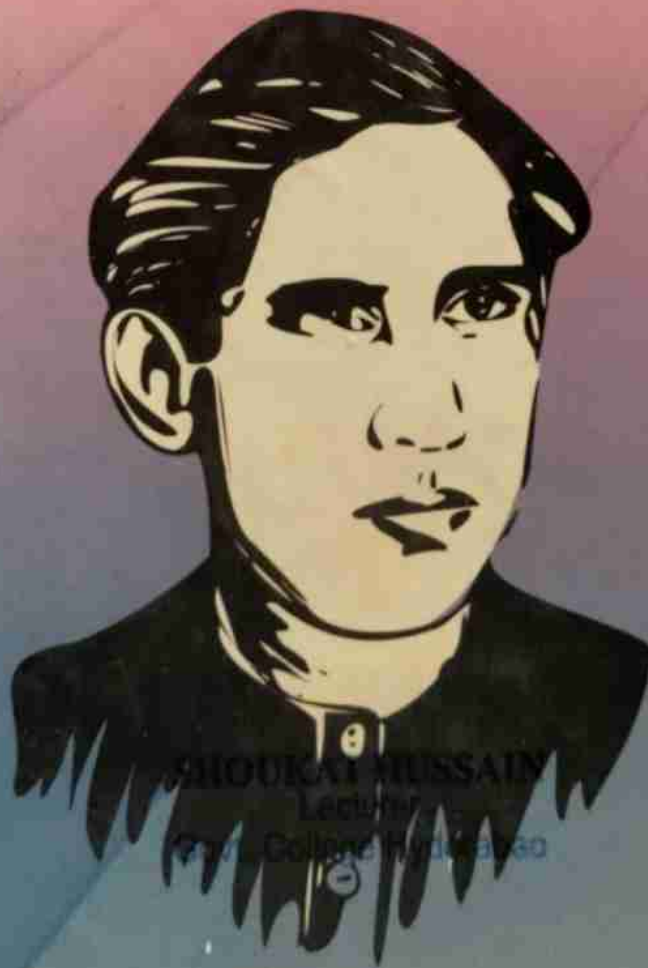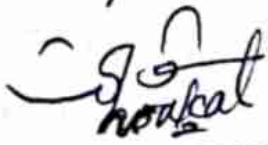
مطالعۂ قابل

(قابل اجمیری ـــ زندگی اور شاعری)

وحید الرحمٰن خان

محمد بلال کے مقالے میں معاونت کے لیے

Shoukat
SHOUKAT HUSSAIN
Lecturer
Govt. College Hyderabad

BOOK HOME

فہرست

کتابِ ہم نشیں — ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام ۵

قابلِ مطالعہ — وحید الرحمٰن خان ۷

۱۔ قابل اجمیری کی زندگی ۹

۲۔ قابل اجمیری کی غزل ۳۱

۳۔ قابل اجمیری کی نظم ۷۸

۴۔ غیر مدون کلام ۹۸

۵۔ کتابیات ۱۱۷

کتابِ ہم نشیں

عزیز گرامی وحید الرحمٰن خان عرصہ دو سال سے شعبہ اقبالیات، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں ریسرچ آفیسر ہیں اور میرے ہم نشیں ہیں۔ یوں ان سے روزانہ ملاقات رہتی ہے۔ وہ ذہین، خوش طبع اور شگفتہ مزاج شخص ہیں۔ اردو زبان کے باذوق ادیب اور محقق ہیں۔ فارسی زبان و ادب میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے ان کے مطالعۂ ادب کا دائرہ یقیناً وسیع ہے۔ لفظ شناسی، ترکیب سازی اور برجستہ گوئی میں انھیں خاص مہارت حاصل ہے۔ ان کی بات بات سے ان کے شاعرانہ ذوق اور اعلیٰ حافظے کا اظہار ہوتا ہے۔ انھیں اردو کے اشعار بکثرت حفظ ہیں جس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ خود بھی یقیناً شاعر ہوں گے لیکن جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ''میں شاعر نہیں ہوں'' تو ان کی دانائی اور دانشوری مزید مسلم ہو جاتی ہے۔

کچھ عرصہ قبل انھوں نے مجھے جواں مرگ شاعر قابل اجمیری کے چند شعر سنائے جو میرے لیے بہت اثر انگیز تھے۔ شعر یہ تھے:

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

اس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو
زندگی کتنی خوبصورت ہے
جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو مری ضرورت ہے

بے نیازی کو اپنی خو نہ بنا
یہ ادا بھی کسی کو پیاری ہے
ان کے حسنِ ستم کا کیا کہنا
لوگ سمجھے خطا ہماری ہے

اب جب انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ قابل اجمیری کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے ایک مکمل کتاب ترتیب دے رہے ہیں تو مجھے بہت مسرت ہوئی۔ میں نے اس تصنیف کا مسودہ دیکھا ہے اور مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ انھوں نے نہایت محنت اور ذہانت سے اردو غزل کے ایک اہم — مگر قدرے گم نام شاعر کو بھرپور طریقے سے متعارف کرایا ہے۔ اب تک قابل اجمیری کے حالاتِ زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب تھیں مگر وحید الرحمٰن صاحب نے بہت محنت اور کاوش سے ان کی سرگزشت تحریر کی ہے۔ انھوں نے قابل اجمیری کی متعدد غیر مدون نظموں کو بھی اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ یہ نظمیں بہت تلاش و جستجو کے بعد پرانے رسائل و جرائد سے حاصل کی گئی ہیں اور یوں یہ کلام پہلی مرتبہ اس کتاب کے توسط سے اہلِ ذوق کی خدمت میں پیش ہو رہا ہے۔

وحید الرحمٰن خان میں نقد و نظر کی خداداد صلاحیتیں موجود ہیں اور انھوں نے قابل اجمیری کی شاعری کا عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ''مداحی'' کے لمحوں میں بھی ''معروضی'' رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی یہ تصنیف قابل اجمیری کی شاعری پر ایک متین، متوازن اور جامع تبصرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں عزیزی وحید الرحمٰن خان کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام
صدر شعبۂ اقبالیات
اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور

قابلِ مطالعہ

ایک دوست نے دریافت کیا ''یار، یوں تو تم مزاح نگار بنے پھرتے ہو، لیکن مقالے کے لیے ایک سنجیدہ غزل گو منتخب کر رہے ہو۔ یہ کیا دو عملی ہے؟''

میں نے ایک مشہور فلمی ڈائیلاگ کا سہارا لیتے ہوئے جواب دیا، ''دوست، بات یہ ہے کہ مزاح میرا پیشہ ہے اور غزل میری محبت......''

—— لیکن مزاح میرا پیشہ بھی نہیں، ہنر ہے۔ ہنر کہاں، عیب ہے۔ جہاں تک غزل کا معاملہ ہے تو میں واقعی اس صنف کی زلفوں کا اسیر ہوں۔ چنانچہ جب ایم۔ اے (اُردو) کے مقالے کے موضوع کے ضمن میں میری رضا پوچھی گئی تو میں نے فوراً قابل اجمیری کا نام پیش کیا۔ اس پیشکش کی ایک وجہ قابل کی دلفریب غزل گوئی تھی اور دوسرا سبب ان کی گمنامی (یا کمنامی) تھا۔ پرانے بزرگ تو ان کے نام اور کلام سے کسی قدر واقف ہیں، لیکن میری نسل کے لوگوں کا یہ حال ہے کہ: پوچھتے ہیں وہ کہ ''قابل'' کون ہے؟

میں نے اس خواہش کے ساتھ مقالے کا آغاز کیا کہ قابل اجمیری سے ادب کے نئے قارئین کو بھی متعارف کرایا جائے۔ بہار کی ہوا آپ اپنا تعارف ہوا کرتی ہے۔ قابل کا کلام یقیناً ایسا ہے کہ اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ میری حیثیت تو بس زلیخا کی سی ہے کہ جو ہر کسی سے ایک ہی فرمائش کرتی ہے: اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو!

قابل اجمیری دنیا میں ایک مختصر عرصۂ زیست کی مہلت لے کر آئے تھے۔ انھوں نے زندگی کی صرف اکتیس بہاریں دیکھیں، لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ہر بہار ان کے دامن میں گلابوں کے بجائے سوکھے ہوئے پات اور نوکیلے خار ہی چھوڑ گئی —— یتیمی، بے روزگاری، بے مہریٔ زمانہ، فریبِ دوستاں اور ایک طویل جان لیوا مرض تپ دق جیسے عناصر سے ان کی منتشر زندگی ترتیب پاتی

ہے۔ وہ اس قلیل اور "علیل" عرصۂ حیات میں حسینۂ شعر کی زلفیں سنوارتے رہے۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، جن میں غزل، نظم، قطعہ، رباعی اور نعت وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن ان کی پہچان کا بنیادی حوالہ غزل ہی بنتی ہے۔ زیرِ نظر مقالے کا ایک باب غزل ہی کے حوالے سے قائم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں قابل کے سوانح، شخصیت اور خدمات کا تفصیلی تذکرہ ہے جبکہ تیسرے باب میں ان کی نظم نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں قابل کا غیر مدون کلام اور قابل کے بارے میں اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے عکس دیئے گئے ہیں۔

اب یہ مقالہ، نظرِ ثانی کے بعد کتابی صورت میں قارئینِ ادب کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ معلوم نہیں کہ محبت کا قرض ادا کر سکا ہوں یا نہیں؟ لیکن پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ قابل شناسی کے ضمن میں میری اس "طرفداری" کو مکمل طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

قابل اجمیری کے فن اور شخصیت کے حوالے سے بہت کم تنقیدی اور معلوماتی مواد دستیاب ہے۔ چنانچہ تحقیق کی غرض سے مجھے سکھر (سندھ) بھی جانا پڑا۔ اس شہر میں قابل صاحب کے پسماندگان یعنی ان کی بیوہ محترمہ نرگس قابل اور فرزند ظفر قابل صاحب قیام پذیر ہیں۔ ظفر صاحب نے اپنے پدرِ مہربان کی یادوں کو بہت قرینے سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ سکھر میں قیام کے دوران محترمہ نرگس قابل نے خاصی شفقت کا مظاہرہ کیا۔ اس موقع پر میں دونوں کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی زبانی مجھے قابل اجمیری کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ قابل اجمیری کے متعلق معلومات اور تنقیدات، سکھر کے سفر کے حاصلات میں سے ہیں۔

میں نے یہ مقالہ ۱۹۹۵ء میں ڈاکٹر فخر الحق نوری صاحب کی مشفقانہ نگرانی میں تحریر کیا تھا جس کے لیے میں استادِ محترم کا ممنون ہوں۔

رفیق احمد نقش، مختار پارس اور افتخار شفیع کے لیے نیک تمنائیں!!!

وحید الرحمٰن خان

(لاہور)

ا۔ قابلؔ اجمیری کی زندگی

ابتدائی حالات:

دن پریشاں ہے، رات بھاری ہے
زندگی ہے کہ پھر بھی پیاری ہے

قابلؔ اجمیری کا اصل نام عبدالرحیم تھا۔ وہ ۲۷ اگست ۱۹۳۱ء کو قصبہ چرلی میں پیدا ہوئے۔ یہ قصبہ ہندوستان کے صوبہ راجستھان کے ضلع اجمیر میں واقع ہے۔ قصبہ چرلی اجمیر سے چوبیس میل کے فاصلے پر ہے۔ قابلؔ کا اجمیر کے مشہور ''دیس والیوں کے خاندان'' سے تعلق تھا۔ یہ خاندان پہلے راجپوت تھا جو شہاب الدین غوری کے حملے کے بعد مسلمان ہوا۔ اس خاندان میں بہت سے ذی حیثیت، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نامور افراد ہوئے۔ قابلؔ کے دادا کا نام چاند محمد، والد کا عبدالکریم اور والدہ کا نام گلاب تھا۔ قابلؔ کے والد تقسیم ہند سے قبل اجمیر میں تعمیرات کی ٹھیکیداری کرتے تھے۔ موصوف بہت فرض شناس تھے۔ وہ خود تیز اور جھلستی ہوئی دھوپ میں گھنٹوں کھڑے رہ کر تعمیری کام کی نگرانی کیا کرتے تھے چنانچہ اس مسلسل اور صبر آزما مشقت کے سبب جسم پر انتہائی مضر اثرات پڑے یہاں تک کہ وہ دق کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ ان پر دق کا پہلا حملہ ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ اس وقت قابلؔ کی عمر صرف ایک برس تھی۔ یہ مرض اس تیزی سے بڑھا کہ ۱۹۳۸ء میں ان کا اجمیر کے لونگیا ہسپتال میں انتقال ہو گیا[۱] اس صدمے سے قابلؔ کی والدہ اس قدر نڈھال ہوئیں کہ وہ بھی چند دنوں کے بعد اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔[۲] ان سانحوں کے بعد قابلؔ اپنے کم سن بھائی کے ہمراہ دنیا میں تنہا رہ گئے۔ ان کے چھوٹے بھائی کا نام شریف اور ہمشیر کا نام فاطمہ تھا۔

معصوم بچوں کی کفالت دادا چاند محمد کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد قابل کو ایک اور صدمے کا سامنا کرنا پڑا جب ان کی صغرسن بہن بھی فوت ہوگئیں۔

اس دور میں تحریکِ پاکستان اپنے عروج پر تھی۔ اس عظیم تحریک کے نتیجے میں ایک علاحدہ اسلامی مملکت کا وجود عمل میں آیا۔ قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کے قافلے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے روانہ ہوئے۔ قابل اجمیری بھی بے سروسامانی کے عالم میں ایک ایسے ہی قافلہ کے ہمراہ یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو پاکستان ہجرت کر آئے۔ پاکستان پہنچنے کے کچھ ہی عرصہ بعد انھیں ایک آزمائش کا سامنا کرنا پڑا جب ان کے چھوٹے بھائی شریف بھی دق کے مرض سے چل بسے۔

قابل کو وراثت میں دو مکان ملے۔ ایک مکان قصبہ چرلی میں واقع تھا جبکہ دوسرا اجمیر میں ترپولیا گیٹ کے باہر پولیس چوکی کے سامنے تھا۔ اب اس مکان کو دوسرے مکانات کے ساتھ منہدم کر کے چشتیہ یادگار گیسٹ ہاؤس تعمیر ہو چکا ہے۔ اس مکان کے صدر دروازہ کے سامنے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی عظیم الشان درسگاہ واقع ہے جس میں دارالعلوم معینیہ عثمانیہ جیسا بلند پایہ تعلیمی ادارہ علم کی روشنی پھیلا رہا تھا۔ یہ ادارہ نظام دکن میر عثمان علی خان نے قائم کیا تھا اور اس کے جملہ اخراجات محکمہ امور مذہبی نظام دکن کی جانب سے برداشت کیے جاتے تھے۔ اس دارالعلوم کی تاریخ ساز خدمات ہیں۔ قابل نے اپنا بچپن اسی درسگاہ کے علمی، ادبی اور روحانی ماحول میں گزارا۔ یہاں عرس کے ایام میں عالم اسلام کے بہت سے مشاہیر علماء اور صوفیائے کرام تشریف لاتے تھے جن کی علمی اور روحانی صحبت سے بے شمار لوگ فیض یاب ہوتے تھے۔ قابل کا بچپن اسی روحانی ماحول سے بہت متاثر ہوا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ان دنوں کی بازآفرینی یوں کی ہے:

سامنے ہے وہ روضۂ پرنور
جو تصور میں جگمگاتا ہے

میرے خواجہ کے آستانے سے
سارا عالم ہی فیض پاتا ہے

قابلؔ نے دارالعلوم معینیہ عثمانیہ ہی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ چھ سال کی عمر میں قرآن شریف ختم کرلیا۔ دس سال کی عمر میں صرف ونحو سیکھنے کے بعد شیخ سعدی کی گلستان اور بوستان کا مطالعہ بھی کرلیا۔ بارہ سال کی عمر میں وہ مدرسہ کے ثانوی درجوں کی تعلیمات مکمل کر چکے تھے۔ وسائل کی تنگی حصولِ علم کی راہ میں رخنہ انداز ہوئی اور انھوں نے تعلیمی سفر کو خیر باد کہہ دیا۔ مدرسہ کا ثانوی درجہ حصولِ تعلیم کی آخری منزل ثابت ہوا۔

محبت کا ناکام تجربہ:

تم نہ مانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے

عمر کے اس دور یعنی لڑکپن میں قابلؔ کی زندگی میں ایک رومان کا ذکر ملتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے قابل کی سوانح عمری مرتب کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ اپنی پڑوسی خطیب وامام مسجد کی بیٹی کے حسن و جمال پر فریفتہ ہوگئے تھے۔[1] محبت کا یہ تجربہ مختصر اور ناکام رہا۔ گمان غالب یہ ہے کہ وہ خطیب عبدالرحمٰن عرب تھے۔ فضل المتین اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں:

''(عبدالرحمٰن عرب) کی ذات اور ان کے گھرانے ہی کی دین قابلؔ کی شاعری ہے...... اگر میں صاف صاف کہوں تو کہنا ہوگا غمِ جاناں عرب صاحب کے گھرانے کی دین تھا اور شکایت عرب صاحب کی ذات سے رہی تھی۔...... مختصر یہ کہ عرب صاحب کی دختر نیک اختر کیلئے قابلؔ اجمیری کی جانب سے باضابطہ پیام دیا گیا تھا اور مولانا خواجہ معنی اجمیری جو قابلؔ اجمیری کے استاد سخن اور مربی ہی نہیں تھے، اس وقت دارالعلوم معینیہ عثمانیہ کے مہتمم بھی تھے، جہاں عرب صاحب بحیثیت مدرس ملازم تھے، کی بھی دلی خواہش تھی کہ رشتہ طے پاجائے لیکن عرب صاحب کی ضد کے آگے کسی کی نہ چلی اور زندگیاں برباد ہوکر رہ گئیں۔''[2]

یہ عبدالرحمٰن عرب کون ذات شریف ہیں؟ اس بارے میں فضل المتین بیان کرتے ہیں کہ جب مدرسہ کی تشکیل عمل میں آئی تو عرب صاحب کا تقرر انھیں گجرات سے بلواکر متولی درگاہ میر

نثار احمد نے کیا تھا۔ وہ قابل کے دادا کے مکان کے بالائی حصے میں کرائے دار کی حیثیت سے رہے۔[۵]

قابل کی زندگی اور شاعری میں محبت کے اس ناکام تجربے نے واضح نقوش مرتب کیے۔ حساس فطرت نے اس واقعے کے گہرے اثرات قبول کیے۔

اداکاری کا شوق:

ع جنونِ شوق نے پہونچا دیا کہاں مجھ کو

لڑکپن میں قابل اجمیری کے دل میں فلمی لائن اختیار کرنے کا سودا سما گیا۔ ماہر القادری نے اس ضمن میں اپنے مضمون بعنوان "قابل اجمیری" میں تفصیل سے لکھا ہے:

"یہ اب سے سترہ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک دن شام کو...... تین چار نوجوان آئے۔ علیک سلیک کے بعد مصافحہ کیا۔ ان میں سے ایک صاحب بولے میں فلمی لائن اختیار کرنا چاہتا ہوں، آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں۔ میں نے اس پر لمبا چوڑا لیکچر دے ڈالا...... اس پر وہ نوجوان ایک خاص تاثر کے ساتھ بولا "جی، یہ تو میری موت اور زندگی کا سوال ہے۔ مجھے اس مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تو خودکشی کرلوں گا۔" اس پر سب لوگ مسکرانے لگے...... اس واقعے کے دو ڈھائی سال بعد ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی...... (کراچی سے میرا ادبی پرچہ) ماہنامہ "فاران" بھی شائع ہونے لگا۔ انھی دنوں دفتر "فاران" میں ایک صاحب تشریف لائے اور کہا کہ میں اجمیر کا رہنے والا ہوں۔ قابل تخلص ہے۔ آپ سے حکیم نصیر میاں کے مکان پر ملاقات ہوئی تھی...... انھوں نے پھر اپنی کئی غزلیں سنائیں۔ ان کے کلام کو سن کر میں چونک پڑا کہ یہ تو آہنگ ہی عجیب ہے اور شاعر کی پیشانی سے سچ مچ "ستارۂ ہوشمندی" طلوع ہو رہا ہے۔ اب نہ وہ "فلم" کا تذکرہ تھا اور نہ کوئی اس قسم کی اور بات تھی......"[۶]

یہ مضمون پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۶۲ء میں "فاران" میں اشاعت پذیر ہوا۔ ابتداء میں مضمون نگار نے لکھا ہے: "یہ اب سے سترہ برس پہلے کی بات ہے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قابل کی عمر اس وقت ۱۴ برس کے لگ بھگ ہوگی جب ان کے دل میں فلم میں اداکاری کرنے کا خیال سمایا۔

شاعری:

ابھی مشکل سے سمجھے گا زمانہ
نیا نغمہ، نئی آواز ہوں میں

قابلؔ اجمیری نے بہت نوعمری میں سخن گوئی کا آغاز کیا اور مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ روزنامہ ''طوفان'' اجمیر نے ۳۱ مارچ ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں ''ریلوے ایڈلر اسکول اجمیر کی گولڈن جوبلی ـــــ غیر طرحی مشاعرہ'' کے عنوان سے خبر شائع کی۔ اس خبر کے مطابق قابلؔ بھی اس مشاعرے میں شریک تھے۔ یوں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قابلؔ تقریباً چودہ برس کی عمر میں شاعری شروع کر چکے تھے اور اسی عمر میں وہ ادبی و شعری محفلوں میں آنے جانے لگے۔ ''اجمیر میں دو مقامات ایسے تھے، جہاں شعراء کی نشستیں جمتی تھیں ـــــ ذکی بازار میں اسلامیہ ہوٹل اور درگاہ بازار کے مختلف چائے خانے...... وہ (قابل) ان ہوٹلوں کی طرف گیا اور پھر انھی کا ہو کر رہ گیا۔''[۷] اس قسم کی محفلوں نے قابل کی شعری تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا۔

قابلؔ ابتداء میں شاہ عبدالرحیم ارمان اجمیری کے تلامذہ میں شامل ہو کر مشقِ سخن کرنے لگے مگر کچھ ہی عرصہ بعد ان سے اصلاح لینا ترک کر دیا۔ ''قابلؔ کے ترکِ تلمذ کا باعث...... ارمان کی استادانہ مہارت اور شعر گوئی کی عدم صلاحیت تھی۔ وہ اور ان کے تلامذہ اس قسم کی شاعری کرتے رہے تھے، جسے قافیہ پیمائی اور تک بندی کا نام دیا جا سکتا ہے۔''[۸]

قابلؔ نے ارمان سے رشتۂ تلمذ منقطع کرنے کے کچھ دنوں بعد مولانا معنی اجمیری سے رابطہ قائم کر لیا۔ مولانا کے فیضِ صحبت سے قابلؔ کی شاعری کو حیاتِ نو ملی۔ انھی کی معیت میں قابلؔ نے پہلی دفعہ آل انڈیا مشاعرے میں شرکت کی۔ یہ مشاعرہ معینیہ اسلامیہ ہائی سکول کے غوثیہ ہال میں منعقد ہوا۔ ''اس مشاعرے میں ہندوستان کے مشہور شعراء موجود تھے، جن میں جگر مرادآبادی، ماہر القادری، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، سیماب اکبرآبادی قابلِ ذکر ہیں۔''[۹]

۱۹۴۵ء سے ان کی شاعری کا شعوری دور شروع ہوتا ہے۔ ان کا کلام متعدد رسائل میں شائع ہونے لگا۔ اسی دوران میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی۔ قابلؔ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور

حیدرآباد میں سکونت اختیار کی۔ اپنی شاعرانہ ہنرمندی کی بدولت بہت جلد ان کا شمار صفِ اول کے شعراء میں ہونے لگا۔ مشاعروں میں انھیں استاد شعراء کے ساتھ پڑھایا جانے لگا۔ اس وقت قابلؔ کی عمر یہی کوئی بیس سال ہوگی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ مرتے دم تک جاری رہا۔

روزگار:

ع تصویر کھینچ لو ستمِ روزگار کی

قابلؔ اجمیری تمام زندگی غمِ روزگار کا شکار رہے۔ ان کی بیماری بھی بیروزگاری کا ایک سبب ہے تاہم قابلؔ کسی نہ کسی صورت میں غمِ روزگار کے تقاضے نبھاتے رہے۔ انھوں نے کچھ عرصہ عرضی نویسی کا پیشہ اختیار کیا۔ صحافت سے بھی منسلک رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب قابلؔ اجمیری حیدرآباد ہجرت کر کے آئے تو اپنے ایک شناسا پیکر واسطی کی وساطت سے روزنامہ "جاوید" میں قطعہ نگاری کا آغاز کیا۔ معاوضے کے طور پر معقول رقم ملنے لگی۔ پیکر واسطی اس اخبار کے چیف ایڈیٹر تھے۔ قابلؔ نے روزنامہ "آفتاب" میں بھی قطعہ نویسی کی۔ علاوہ ازیں انھوں نے مختصر پیمانے پر ایک پریس بھی قائم کیا۔ "پاکستان پریس" کے نام سے قائم ہونے والا یہ پریس زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔[۱۰] قابلؔ کی معاشی زندگی کا انحصار مشاعروں کے معاوضے میں ملنے والی رقم پر بھی تھا۔ ان کی غربت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ معاشی عدم استحکام کی وجہ سے اپنا علاج مکمل طور پر نہ کر سکے اور دق جیسی موذی مرض کا شکار ہو گئے۔

شادی:

کچھ دیر کسی زلف کے سائے میں ٹھہر جائیں
قابلؔ غمِ دوراں کی ابھی دھوپ کڑی ہے

قابلؔ اجمیری نے زندگی کی صرف اکتیس بہاریں دیکھیں۔ حیاتِ مختصر کے آخری سال، انھوں نے "اجل کی گود" میں گزارے۔ وہ متعدد بار مختلف ہسپتالوں اور شفاخانوں میں زیرِ علاج رہے۔ ۱۹۶۰ء میں وہ اپنی دیرینہ بیماری تپ دق کے علاج کی غرض سے کوئٹہ کے ریلوے سینی

ٹوریم میں داخل ہوئے۔ یہاں ان کی ملاقات ایک عیسائی نرس نرگس سوسن سے ہوئی۔ اس خاتون نے نہایت انس اور ہمدردی سے قابلؔ کی دیکھ بھال کی۔ اس ربطِ خاطر ایک وجہ قابلؔ کی شاعری بھی تھی۔ وہ ان کی سخن گوئی سے بہت متاثر ہوئیں۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے بتایا کہ انھی ایام میں قابلؔ نے اپنی کتاب ''قابل کے سو اشعار'' مطالعہ کیلئے دی۔[۱۱] یوں یہ انسیت رفتہ رفتہ محبت کا روپ اختیار کر گئی۔ اس تعلقِ خاطر نے بیمار شاعر کے اندر زندگی کرنے کی لگن پیدا کی اور وہ بیماری کے خلاف مصروف جہاد ہو گئے:

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو مری ضرورت ہے

نرگس سوسن نے اپنے مذہب کو خیر باد کہا اور جلد ہی دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ نرگس قابلؔ کہلانے لگیں۔ ایک انٹرویو میں وہ بیتے دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''میں نے محسوس کیا کہ قابلؔ بہت دکھی انسان ہیں...... میں نے سوچا شاید میرا سہارا ان کی مایوس زندگی میں نئے خواب بکھیر دے چنانچہ میں نے ان سے شادی کر لی۔''[۱۲]

یہ شادی یکم اپریل ۱۹۶۰ء کو ہوئی۔ روزنامہ ''جنگ'' کراچی نے ۱۹ اپریل ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں ''بیمار شاعر کی تیمار دار سے شادی'' کے عنوان سے خبر شائع کی۔

قابلؔ کی طبیعت قدرے سنبھلی تو میاں بیوی حیدرآباد آ گئے۔ وفا شعار بیوی نے ان کا گھر پر علاج اور تیمارداری جاری رکھی۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو ان کے ہاں ایک بچے کی ولادت ہوئی جس کا نام قابلؔ نے روشن ضمیر رکھا۔ روشن ضمیر کا موجودہ نام ظفر قابل ہے۔ قابلؔ اجمیری کچھ عرصہ بعد انتقال کر گئے۔ یوں شادی کا یہ خوبصورت بندھن صرف دو برس قائم رہ سکا۔ بیوہ قابلؔ ان دنوں اپنے بیٹے ظفر قابل کے ہمراہ سکھر میں مقیم ہیں۔

ایک نزاعی مشاعرہ کا احوال:

ع کیسی کیسی محفلوں میں زلزلے آنے لگے

معاصرانہ چشمک اور معرکہ آرائی ادب کی دنیا کا لازمہ ہیں۔ اگر یہ رویے مثبت طرزِ عمل کے حامل ہوں تو تخلیق کاری میں تحریک کا باعث بنتے ہیں۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ محمد طفیل نے ''ادبی معرکے نمبر'' کے عنوان سے ''نقوش'' کا ایک خاص نمبر شائع کیا تاہم یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اس قسم کے معرکے عموماً فریقین کیلئے دل آزاری اور بدمزگی کا سبب بنتے ہیں۔ اس طرح کے قضیوں سے ادبی فضا بھی متاثر ہوتی ہے۔

قابلؔ اجمیری کی زندگی بھی اس طرز کی ہنگامہ آرائی سے خالی نہیں۔ اس ضمن میں ایک مشاعرہ کا احوال اہمیت کا حامل ہے اور آج تک زیرِ بحث چلا آ رہا ہے۔ یہ مشاعرہ اگست ۱۹۶۲ء میں جام شورو میں منعقد ہوا۔ اب اگرچہ یہ مشاعرہ قصۂ پارینہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے مگر گاہے گاہے بازخوانی کا عمل بھی جاری ہے۔ قابلؔ اجمیری کے ایک معاصر محسن بھوپالی اس مشاعرے کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مجھے اچھی طرح یاد ہے مشاعرہ شباب پر تھا اچانک صدرِ مشاعرہ (قابلؔ) نے مائک سنبھالا...... ''حضرات، میری صدارت پر ایک میرے ہم عصر شاعر کو اعتراض ہے، اس لیے منتظمین کے کہنے پر صدارت سے دست بردار ہوتا ہوں اور اور میں گھر جا رہا ہوں......'' اجمیری اسٹیج سے اتر کر بھاری قدموں کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھنے لگے...... میں تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا اور میں نے قابلؔ صاحب کا ہاتھ تھام لیا۔ چند لمحوں میں قابلؔ صاحب مسندِ صدارت پر تھے۔''[۱۳]

یہ تحریر متعدد بار اشاعت پذیر ہوئی۔ اس میں حمایت علی شاعر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بعد ازاں انھی یادوں کو بنیاد بناتے ہوئے ماہنامہ ''سرگزشت'' اکتوبر ۱۹۹۲ء میں ڈاکٹر ساجد امجد نے قابلؔ اجمیری کی سوانح عمری مرتب کی اور واضح الفاظ میں شاعر پر ''قابل دشمنی'' کا الزام عائد کیا۔

اپنے دفاع میں حمایت علی شاعر کا قسط وار جواب مضمون ''قومی اخبار'' (ہفتہ وار میگزین، ۴ جون تا ۹ جولائی ۹۳ء ـــ چھ اقساط) میں ''آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ وہ بیان کرتے ہیں:

''محسن صاحب کا یہ مضمون جب تیسری بار (میری تصویر کے ساتھ) ۵ نومبر ۸۵ء کو روزنامہ

''پاسبان'' (حیدرآباد) میں چھپا تو سید کاظم رضا (ایڈیٹر فکر و عمل، مرتب ''قابل نمبر'' ۳۰ ستمبر ۷۷ء) نے دوسرے ہی ہفتے یعنی ۱۲ نومبر ۸۵ء کو اسی اخبار میں ایک جوابی مضمون لکھا۔ تھوڑا سا اقتباس اس کا پڑھ لیجیے:

''محسن صاحب نے اپنے مضمون میں (جام شور وکے) جس مشاعرے کا ذکر کیا ہے اس مشاعرے کے منتظمین نے محسن کے ممدوح (چونکہ محسن صاحب نے میرا نام نہیں لیا تھا، اس لیے کاظم رضا نے بھی نام کے بجائے ''ممدوح'' لکھا ہے) سے رابطہ کر کے انھیں بہ اصرار اس امر پر آمادہ کیا تھا کہ وہ مذکورہ مشاعرے کی صدارت قبول کر لیں، مگر محسن صاحب کو یہ بات گوارا نہ ہوئی۔ انھوں نے اندر ہی اندر ساز باز کر کے صدارت کی مسند پر قابلؔ اجمیری مرحوم کو بٹھا دیا۔ جب محسنؔ کے ممدوح (یعنی شاعرؔ) مشاعرہ گاہ پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جس مشاعرے کی صدارت کیلئے انھیں مجبور کیا گیا تھا وہاں کسی چال کے تحت قابلؔ اجمیری مرحوم کو صدر بنا دیا گیا۔ محسن بھوپالی کے ممدوح نے اس طرزِ عمل کے خلاف احتجاج کیا تھا، مگر احتجاج کا رخ ہرگز قابلؔ اجمیری مرحوم کی طرف نہیں تھا بلکہ وہ اس غلط روش کا منتظمین کو احساس دلانا چاہتے تھے۔ محسن صاحب کے ممدوح نے احتجاج بھی کیا اور پھر بعد میں قابلؔ اجمیری مرحوم کی صدارت میں کلام بھی سنایا...... انھوں (محسن بھوپالی) نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اپنے ممدوح کے احتجاج کا رخ قابل اجمیری مرحوم کی ذات کی طرف موڑ کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہا۔''

یہاں حمایت علی شاعرؔ نے سید کاظم رضا کی زبان سے اپنا دفاع کیا ہے تاہم شاعر کے اس بیان سے اختلاف کی گنجائش نکلتی ہے۔ شاعر نے کاظم رضا کی زبانی کہا ہے کہ انھوں نے اس مشاعرے میں قابلؔ کی صدارت میں کلام بھی سنایا جبکہ پندرہ روزہ ''رہنما'' حیدرآباد اپنی ۱۷ اگست ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں مشاعرے کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''حمایت علی شاعر اپنا کلام سنائے بغیر چلے گئے۔''

''بزمِ شعر'' کی یہ الگ الگ خبریں صورتحال کو پیچیدہ بناتی ہیں۔ ادھر بیوہ قابل کو بھی شاعرِ محترم سے شکایت ہے: ''قابلؔ کی وفات کے بعد شاعر صاحب صرف ایک بار تعزیت کیلئے آئے تھے۔ محسن صاحب آج بھی ہمارے ہاں آتے ہیں۔''[۱۴]

شاعر صاحب کا تعزیت کے لیے چل کر جانا ان کی وسعتِ قلبی کو ظاہر کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے

کہ شاعر اور محسن کی معاصرانہ چشمک پرانی ہے جو بدستور قائم ہے۔اس تناظر میں جام شورو کا مشاعرہ معرکہ آرائی کی اس طویل داستان کا ایک باب دکھائی دیتا ہے۔

بیماری اور وفات:

ع گزاری نزع کے عالم میں تو نے عمر اے قابلؔ

دق کا مرض قابل اجمیری کو وراثت میں ملا۔ابھی ان کی عمر اٹھارہ برس تھی کہ ان کے اندر اس موذی مرض نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔۱۹۴۹ء میں طبی معائنے سے ثابت ہوا کہ ان کے جسم میں دق کے جراثیم موجود ہیں۔فوری طور پر اس مرض کا علاج کیا گیا جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور وقتی طور پر وہ تندرست ہو گئے۔روزنامہ ''آفتاب'' (حیدرآباد) اپنی ۱۶ نومبر ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:''ادبی حلقوں میں یہ خبر نہایت مسرت سے سنی جائے گی کہ قابل اجمیری جو چار ماہ سے دق کے عارضے میں مبتلا ہیں......اب رو بہ صحت ہیں۔''

کچھ ہی عرصہ بعد یہ بیماری عود کر آئی۔ان دنوں قابل کی مالی حالت اتنی اچھی نہ تھی چنانچہ ادبی حلقوں نے حکومتِ سندھ سے تعاون کی اپیل کی۔اس ضمن میں اخبارات میں متعدد بار حکومت سے امداد کی درخواست کی گئی۔یہ کوششیں رنگ لائیں اور اکتوبر ۱۹۵۳ء کے پہلے ہفتے میں سندھ کے وزیرِ صحت پیر علی محمد راشدی نے قابل کے علاج کے سلسلے میں سولہ ہزار روپے کے عطیے کا اعلان کیا۔ یہ وعدہ ایفائے عہد کے مرحلے تک نہ پہنچ سکا۔حکومت کے اس طرزِ تغافل پر بہت احتجاج ہوا۔ اخبارات میں اداریے لکھے گئے۔کالم نگاروں نے کالم تحریر کیے۔مجید لاہوری نے اپنے مخصوص انداز میں اپنے کالم ''حرف و حکایت'' (''جنگ'' کراچی: ۱۲ فروری ۵۴ء) میں تحریر کیا:

''......مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ حکومت نے یہ اعلان نہیں کیا بلکہ ایک اچھا شعر کہہ دیا جس پر ہر طرف سے اسے داد ملی اور بس''

اسی دوران میں سندھی اخبارات نے یہ موقف اختیار کیا کہ ایک مہاجر اردو شاعر کو تو سندھ حکومت عطیے کی رقم سے نواز رہی ہے لیکن بیمار اور مفلس سندھی ادیبوں اور شاعروں کی حالت پر توجہ نہیں دی جا رہی۔سندھی اخبار ''ہلال پاکستان'' حیدرآباد نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں ''سخاوت'' کے طنزیہ عنوان سے اداریہ شائع کیا۔علاوہ ازیں سندھی زبان کے صحیفہ ماہنامہ ''فردوس

بالا'' نومبر ۱۹۵۰ء میں ایک مضمون بعنوان ''سندی شاعر ن بی انصافی'' اشاعت پذیر ہوا۔ حکومت کے وعدے کی عدم تکمیل کا ایک سبب یہ ردِ عمل بھی ہو سکتا ہے۔ بہر کیف ساتھ ہی ساتھ قابل کے علاج کے لیے احتجاج جاری رہا۔ آخر کار سندھ کابینہ نے ۱۰ جون ۱۹۵۵ء کو قابل کو معالجے کیلئے اٹلی بھیجنے کی نوید سنائی۔ حکومت کا یہ وعدہ بھی ''وعدۂ محبوب'' ثابت ہوا۔ قابل ایڈیٹر کے نام خط میں دل کا بوجھ ان الفاظ میں ہلکا کرتے ہیں:

''میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اٹلی جانے کا سبز باغ دیکھنے کے بجائے بہ تعجیلِ ممکنہ پاکستان کے کسی سینی ٹوریم میں داخلہ لے کر علاج جاری رکھا جائے۔''[۱۵]

چنانچہ ۲۱ جون ۱۹۵۶ء کو فاطمہ جناح سینی ٹوریم کوئٹہ میں داخل ہو گئے۔ ابھی وہ مکمل طور پر صحت یاب نہ ہوئے تھے کہ اربابِ اختیار نے ۱۱ جون ۱۹۵۷ء کو انھیں ہسپتال سے خارج کر دیا حالانکہ بیماری کے جراثیم ابھی بدن میں موجود تھے۔ ۱۹۶۰ء میں قابل ایک بار پھر کوئٹہ آئے اور ریلوے سینی ٹوریم میں داخل ہوئے۔ یہاں ان کی ملاقات ایک نرس نرگس سے ہوئی جو بعد ازاں ان کی شریک حیات ہوئیں۔ طبیعت ذرا بحال ہوئی تو وہ اپنی اہلیہ کے ہمراہ حیدر آباد آ گئے۔ وفادار بیوی نے گھر پر تیمارداری جاری رکھی مگر موت کے آگے ___ کوئی دعا کوئی حمد و ثنا نہیں چلتی۔ قابل خصوصی توجہ کے باوجود جانبر نہ ہو سکے۔ ان کی بیوہ اس سانحہ کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''قابل صاحب کو میں نے گھر پر ہی رکھا اور اب وہ پہلے کی نسبت اچھے ہوتے جا رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ہمارے بچے کی پہلی سالگرہ تھی، میں خوش تھی، وہ بھی خوش تھے، لیکن اچانک انھوں نے خون تھوکا۔ میں گھبرا کر ہسپتال کی جانب دوڑی اور ایمبولینس کیلئے کہہ کر آئی لیکن جب گھر پہنچی تو ان کی حالت بہت نازک تھی۔ میں نے فوراً ان کے دوستوں کی مدد سے انھیں ہسپتال پہنچانا چاہا...... قابل صاحب ان لوگوں سے سنبھل نہ سکے اور زمین پر آ رہے۔ خون کافی مقدار میں پہلے ہی بہہ چکا تھا۔ یہ دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔ انھوں نے مجھے دیکھا اور دھیمے سے پکارا اور پھر ان کا سر دوسری جانب ڈھلک گیا۔''[۱۶]

تپ دق نے آخر کار ان کی جان لے لی ___ دیکھا اس ''بیماریٔ دق'' نے آخر کام تمام کیا۔ یہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۲ء کا سانحہ ہے۔ ایک طویل بیماری کی اذیت میں مبتلا رہنے کے بعد قابل اجمیری خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

قابلؔ اجمیری مرحوم کو حیدرآباد کے پھلیلی قبرستان میں دفن کیا گیا۔

شخصیت:

دیگر مجرد اشیاء کی طرح ''شخصیت'' کی بھی کوئی معین تعریف نہیں کی جا سکتی۔ شخصیت کی تعریف کے ضمن میں ماہرینِ نفسیات کا معاملہ ''جیسے جس کے گمان میں آئی'' والا رہا تاہم مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شخصیات فرد کے نفسی کوائف، باطنی خصائص، فطری میلانات اور اندرونی جبلتوں کے اشتراک سے جنم لیتی ہے۔ اس ضمن میں فرد کی اخلاقی اور سماجی حیثیت، نفسیاتی ساخت اور جسمانی خصوصیات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں فرد کی عادات، روایات، ماحول، کردار اور مزاج کی اہمیت مسلمہ ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کی شخصیت ادبی تنقید کے حوالے سے کیا اہمیت رکھتی ہے؟ کیا شاعر کی شخصیت اس کی شاعری پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے؟ اور کیا کسی شاعر کے کلام کا جائزہ لینے کیلئے اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو جاننا اور سمجھنا ضروری ہے؟ — ان سوالات کا جواب میرا جی کی کتاب ''مشرق و مغرب کے نغمے'' سے حاصل کیا جا سکتا ہے:

''جب تک ہم کسی مصنف یا شاعر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے متعلق معلومات حاصل نہ کر لیں، ہم ان کی ادبی تخلیقات یا کلام کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہر مصنف یا شاعر کی تخلیقات، خواہ اس کا فنی اصول داخلی ہو یا خارجی اس کی اپنی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔''[۱۷]

دراصل یہ کسی فن پارے کو جاننے اور پرکھنے کا نفسیاتی طریقہ کار ہے۔ نفسیاتی نقاد شاعر کی شخصیت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی تخلیقات کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ ادیب کی شخصیت، کردار، ذہن اور اعصاب تک اپنے مخصوص نظام کے تحت رسائی حاصل کرتا ہے۔ وہ لمحۂ تخلیق سے قبل اور اس کے دوران تخلیق کار کے نفسی عوامل اور شخصی محرکات کو اپنی تنقید کی اساس بناتا ہے۔ ''نفسیاتی نقاد

کا یہ عقیدہ ہے کہ...... تخلیق ادیب کی شخصیت...... کے کل کا ایک جزو ہے۔''[۱۸]

شاعر کی شخصیت اس کے کلام کی تشریح و تفہیم میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذیل میں قابل اجمیری کی شخصیت کا ایک جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

قابلؔ اجمیری کا ایک پر کشش اور دلآویز شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی بیوہ کے بقول ''بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو بہت ہی پر کشش ہوتی ہیں یا پھر یوں ہوتا ہے کہ غم کی پرچھائیاں پڑنے کے بعد بعض چہرے اور بھی نکھر جاتے ہیں''[۱۹] قابل صاحب کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی جاذبیت اور سحر تھا۔ وہ بہت جلد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے۔ پہلی نظر میں وہ اداس اداس نظر آتے، لیکن جب وہ کھل جاتے تو ان کی حاضر جوابی اور خوش طبعی بھی دیکھنے کی چیز ہوتی۔

قابلؔ اجمیری کی رنگت سانولی سلونی تھی، چہرہ کتابی، آنکھیں روشن، پیشانی چوڑی اور قد نکلتا ہوا تھا۔ وہ سر کے بال نہایت سلیقے سے جمائے رکھتے تھے۔ اپنی بیماری کے باعث کھانے پینے میں احتیاط برتا کرتے تھے، بد پرہیزی نہیں کرتے تھے۔ پان البتہ شوق سے کھاتے تھے (اور کثرت سے کھاتے تھے) بڑے گوشت کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ بکری کا گوشت شوق سے تناول کرتے۔ کدو ان کی پسندیدہ ڈش تھی۔ کھیر بھی بہت پسند کرتے تھے۔ وہ عموماً شیروانی اور پاجامہ زیبِ تن کیا کرتے۔ کبھی کبھار پینٹ شرٹ بھی پہن لیتے۔ آمدورفت کیلئے تانگہ بطور سواری استعمال کرتے تھے۔

کسی انسان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں بیرونی ماحول اور خارجی حالات و واقعات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ قابلؔ صاحب کے اجمیر کے مکان کے عقبی دروازے کے سامنے خواجہ معین الدین چشتی کی عظیم الشان درگاہ تھی۔ یہ ان کی نوعمری اور لڑکپن کا زمانہ ہے۔ اس دور میں ان کے کان شہرہ آفاق قوالیوں، نغمہ نوازوں کی صداؤں اور سخن وروں کے شعروں سے آشنا ہوتے رہے۔ ''وہ گھر بیٹھے بیدم کی نعتیں، سعدی، حافظ شیرازی اور امیر خسرو کا صوفیانہ کلام سنتے رہے۔''[۲۰] یہی وجہ ہے کہ ان کی ذات میں دردمندی، درویشی اور عاجزی کے رنگ جھلکتے ہیں۔

شاعر عام طور پر رومان پسند ہوتے ہیں اور اکثر انھیں جان و دل عزیز نہیں ہوتے۔ قابلؔ کی زندگی میں بھی جذباتی واردات کا تذکرہ ملتا ہے۔ اجمیر میں جب وہ سنِ شعور کو پہنچے تو ایک دوشیزہ کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گئے مگر اس تجربے میں انھیں سخت ناکامی ہوئی۔ ناکام محبت کے اس

تجربے نے ان کی شخصیت اور شاعری پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

حدیثِ کاکل و رخسار ہم بھی رکھتے ہیں
کوئی سنے تو غمِ یار ہم بھی رکھتے ہیں

قابل اجمیری قناعت پسند اور سادہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ان کی تربیت جن ہاتھوں میں ہوئی تھی، ان کا بچپن جن صحبتوں میں گزرا تھا، اس سے انھوں نے یہ سیکھا تھا کہ کبھی ضرورت سے زیادہ پاؤں نہ پھیلائے جائیں۔قناعت اور سادگی سے دن گزارے جائیں۔ڈاکٹر ساجد امجد ان کی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے وقت ایک متروکہ عمارت خالی پڑی اپنے کسی قابض کا انتظار کر رہی تھی۔وہ عمارت اتنی بڑی تھی کہ بعد میں اس میں کالج کھول دیا گیا۔(اورینٹل کالج)۔قابل کے ہاتھ وہ عمارت لگ گئی۔وہ چاہتے تو پوری عمارت پر قبضہ کر سکتے تھے۔اپنے تصرف میں نہ بھی لاتے تو اسے فروخت کر کے یا کرائے پر دے کر پیسے کما سکتے تھے۔دیکھا جائے تو یہ ان کا حق بھی تھا اس لیے کہ وہ ایک چھوڑ دو دو مکان چھوڑ کر آئے تھے۔یہ عمارت ان مکانوں کا معاوضہ بھی ہو سکتی تھی لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا۔اس عمارت کے صرف ایک کمرے پر اس نے قبضہ کر لیا۔ان کے دوستوں نے کہا بھی کہ کیوں موقع ہاتھ سے نکالتے ہو، پوری بلڈنگ پر اپنا تالا ڈالو جی، لیکن ان کا کہنا تھا، میرے لیے ایک کمرہ بہت ہے۔تنہا آدمی ہوں، زیادہ کی ہوس کیوں کروں۔[۱۲] قناعت پسندی کی یہ مثال ان کے کردار پر بخوبی روشنی ڈالتی ہے۔

قابل اجمیری کی بیوہ نے راقم کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ شخصی اعتبار سے وہ بہت نرم خو انسان تھے۔ہمدردی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔وہ مصیبت میں دوسروں کے کام آتے لیکن دوسروں کو اپنا کام نہیں کہتے تھے۔حسن ظہیر ان کی شخصیت کے حوالے سے اپنی یادیں یوں ترتیب دیتے ہیں۔''ہم لوگ (قابل اجمیری، حسن ظہیر اور منظر حسین) وہاں سے اٹھ کر پھر سرفراز کالونی میں گھومنے لگے اور پھر لوگ ادھر ادھر سے آ کر قابل صاحب کی صحت کے بارے میں پوچھتے۔وہ ہر شخص سے اس کی خیریت دریافت کرتے، ان کے حالات اس طرح معلوم کرتے جیسے وہ ان ہی کے گھر کے کوئی فرد ہوں۔کوئی کہتا قابل صاحب مجھے پلاٹ الاٹ کرا دیں تو قابل ان سے وقت مقرر کرتے کہ ضرور تمہارا کام ساتھ جا کر کرا دوں گا۔کوئی مکان بنوانے کیلئے

قابؔل صاحب سے کہہ رہا ہے کہ بینک کے منیجر سے سفارش کر دیجیے، کوئی کہتا کہ کمشنر کے یہاں میری دکان کے کاغذات پڑے ہیں اور قابؔل صاحب سب کو تسلی بخش جواب دے کر مطمئن کر رہے ہیں۔ اف، کس درجہ عظیم شخص تھا جو زندگی بھر اپنے لیے کچھ نہ کر سکا اور لوگوں کی بڑی سے بڑی مشکل حل کرنے کیلئے ہمہ وقت تیار، کس درجہ حساس دل، کس قدر ہر دلعزیز۔'' [۲۲]

انسانی ہمدردی کا عنصر ان کی ذات میں موجود تھا۔ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر اس کی حتی الامکان مدد کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس ضمن میں عبدالرحمٰن اجمیری (ادیب فاضل) کا واقعہ خاصا اہم ہے جو خادمی اجمیری نے بیان کیا ہے۔ [۲۳] عبدالرحمٰن اجمیری بھی اسی موذی مرض کا شکار ہو گئے جس میں قابؔل صاحب مبتلا تھے۔ اس زمانے میں ان کی قابؔل صاحب سے معمولی شناسائی تھی، اگر کوئی دوسرا ہوتا تو کیوں خیال کرتا مگر جب قابؔل صاحب کو معلوم ہوا کہ وہ بھی اس مرض میں مبتلا ہیں تو فوراً عبدالرحمٰن صاحب کے پاس آئے اور نہایت اخلاق و محبت کے ساتھ ان کی ڈھارس بندھوائی اور باوجود اس کے کہ وہ خود مریض تھے۔ ان کے علاج کے سلسلے میں ہر طرح کی مدد کی۔ ڈاکٹروں سے مشورے کیے، ایکسرے کرائے اور اپنی صحت کی پروا کیے بغیر ان کے علاج میں مصروف ہو گئے۔ اس موقع پر قابؔل اجمیری کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ جس میں ان کے جذبۂ ہمدردی اور جواں مرگی کے حوالے سے معنی خیز بات کہی گئی ہے:

کچھ اپنے دل پر بھی زخم کھاؤ، مرے لہو کی بہار کب تک
مجھے سہارا بنانے والو میں لڑکھڑایا تو کیا کرو گے؟

ان کی بیوہ کے بقول وہ ایک خوددار انسان تھے۔ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے تھے۔ [۲۴] تنگ دستی اور غربت کے ایام میں بھی انھوں نے اپنی انا اور خودی کو برقرار رکھا اور کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا پسند نہیں کیا۔ ساجد امجد ان کی شخصیت کے اس رخ کے حوالے سے ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

''......اس کا ایک قدردان اسے ہوٹل میں لے گیا، چائے کا آرڈر دیا لیکن قابؔل نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ وہ چائے نہیں پیتا۔ بعد میں اس کے ایک دوست نے جو اس وقت ساتھ تھا اس سے پوچھا آپ تو بہت چائے پیتے ہیں، پھر آپ نے یہ کیوں کہا؟'' اس لیے کہ اس وقت

میرے پاس بل ادا کرنے کیلئے پیسے نہیں تھے۔ ان صاحب کو میں نے کبھی چائے نہیں پلائی تھی اور نہ آئندہ امکان تھا کہ بدلہ اتار سکتا۔ پھر کس منہ سے ان کی چائے پیتا۔"[۲۵] اسی طرح خادمی اجمیری "کچھ یادیں" کے عنوان سے ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ جگر مرادآبادی جب پہلی مرتبہ پاکستان آئے اور انھیں معلوم ہوا کہ قابلؔ صاحب علیل ہیں تو ان کی مزاج پرسی کو گئے۔ جگر صاحب کو علم تھا کہ وہ بہت حساس اور خوددار انسان ہیں۔ ان کی مالی حالت ٹھیک نہیں لیکن وہ ایک پیسہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ اس لیے اٹھتے وقت جان بوجھ کر اپنا پرس تکیے کے نیچے چھوڑ کر چلے آئے۔ قابلؔ صاحب نے جب بٹوہ دیکھا تو فوراً ایک شخص کے ہاتھوں بٹوہ ان کو واپس بھجوا دیا۔ قابل کا ایک شعر ملاحظہ ہو جس میں اپنی خودداری کا تذکرہ ہے:

نامرادی نے کر دیا خوددار
اب سرِ شوق خم نہیں ہوتا

قابلؔ صاحب کو قدرت نے متاعِ وضعداری سے نوازا تھا۔ "وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ۵۲ء میں راقم الحروف (خادمی اجمیری) کے زیرِ اہتمام مولانا انوار الحق نہال اجمیری کی صدارت میں بزمِ خادم کا سالانہ مشاعرہ ہوا جس میں قابلؔ صاحب کو بھی مدعو کیا گیا۔ جنوری کا مہینہ تھا، سردی شباب پر تھی۔ مشاعرہ شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے مجھے خیال آیا کہ خدا کرے قابلؔ صاحب آج تشریف نہ لائیں۔ اس لیے کہ وہ بیمار ہیں اور آج سردی بہت زیادہ ہے۔ یہ خیال دل میں گزرا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ قابلؔ صاحب ایک معمولی ٹھنڈی شیروانی میں ملبوس تشریف لا رہے ہیں۔ قابلؔ صاحب کو اس عالم میں دیکھ کر دل بے چین ہو گیا۔ میں نے کہا، آپ نے غضب کیا کہ سردی میں بیماری کے باوجود گھر سے نکل پڑے تو حسبِ عادت مسکراتے ہوئے کہا، کیسے ممکن تھا کہ حضرت نہال کی صدارت میں مشاعرہ ہو، جس کا دعوت نامہ آپ کی جانب سے ملے شرکت نہ کروں۔ اس سے بڑھ کر وضعداری کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔"[۲۶]

خادمی اجمیری ان کی وضعداری کے حوالے سے ایک اور واقعہ یوں رقم کرتے ہیں:

"انتقال سے دو تین ماہ پہلے کا ذکر ہے کہ میرپور خاص میں آل پاکستان مشاعرہ تھا۔ اراکینِ مشاعرہ کراچی کے پیشہ ور شاعروں سے معاملات طے کر کے میرپور واپس جاتے ہوئے

حیدرآباد میں میرے پاس آئے اور کہا کہ میرپور خاص کے عوام کی خواہش ہے کہ اس مشاعرے میں قابل صاحب ضرور شریک ہوں لیکن پیسے کی کمی ہے کیونکہ کراچی کے کچھ شعرائے کرام کو مجبوراً زیادہ پیسے دینے پڑ رہے ہیں، کوئی صورت ہو کہ قابل صاحب بغیر کسی مطالبہ کے مشاعرہ میں شرکت کا وعدہ کرلیں۔ آپ اس سلسلے میں ہماری مدد کریں۔ میں چونکہ قابلؔ صاحب کی اخلاقی روش سے واقف تھا۔ اس لیے اراکینِ مشاعرہ کے ہمراہ ان کے مکان پر جا کر مدعا عرض کیا تو آپ نے بلاتوقف شرکت کا وعدہ فرمالیا اور حسبِ وعدہ شرکت بھی فرمائی۔"[۲۷]

قابلؔ اجمیری نے کیا خوب کہا ہے:

خیالِ خاطرِ احباب اور کیا کرتے
جگر پہ زخم بھی کھائے، شمار بھی نہ کیا

ان تمام خوبیوں کے باوصف قابلؔ اجمیری بہرحال ایک انسان تھے، فرشتہ نہ تھے۔ ان کی شخصیت میں مختلف خوبیاں اور اوصاف جمع ہو گئے تھے لیکن دیگر انسانوں کی طرح ان کی ذات بھی خامیوں اور کوتاہیوں سے یکسر مبرا نہ تھی۔ انسان یوں بھی خیر و شر کا مجموعہ ہے۔ خیر و شر کا امتزاج ہی انسانیت کی دلیل ہے۔ قابلؔ صاحب کے ہاں بھی بعض بشری خامیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر عملی اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ ایک کامیاب انسان ہرگز نہ تھے تمام عمر وہ روزگار کا کوئی معقول اور مستقل ذریعہ اختیار نہ کرسکے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر کریم الدین احمد تحریر کرتے ہیں:

"عملی زندگی میں وہ ایک ناکام انسان تھے۔ اس ناکامی کی وجہ دریافت کرنا مشکل ہے، لیکن اگر ان کے مرض (عاشقوں کے مرض، تپ دق) کو اس کی وجہ قرار دی جائے تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا جائے گا کہ ان کی جذباتی زندگی بھی ناکام تھی۔"[۲۸]

قابل کے ایک شناسا ناظر کامرانی نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

"(وہ) کان کے کچے اور دل کے پکے (تھے)"[۲۹]

ان کی بیوہ کے بقول وہ مزاج کے تیز تھے۔ غصے میں جلد آجاتے تھے۔

غور سے دیکھیں تو قابلؔ کی شخصیت کا یہ رخ بھی بے ضرر اور سادہ سا ہے۔ تصویر کا یہ پہلو مثبت نہیں مگر اس کی منفیت قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ قابلؔ اجمیری

کی شخصیت میں، جہاں چند بشری کمزوریاں اور خامیاں دکھائی دیتی ہیں، وہاں بے شمار شخصی خواص اور کرداری خوبیاں بھی ملتی ہیں۔ وہ ایک معتدل اور متوازن شخصیت کے حامل تھے۔ قابل نے یہ شعر شاید اپنے بارے میں کہا تھا:

اس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو
زندگی کتنی خوبصورت ہے

ادبی خدمات:

قابل اجمیری ایک خوش فکر اور نغز گو شاعر تھے۔ قابل کی زندگی میں ان کا کوئی مجموعہ اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔ سوائے ایک مختصر سی کتاب (کتابچہ) کے۔ اس کتابچے کا عنوان ''قابل کے سو شعر'' تھا۔ ان کی پہلی برسی کے موقعہ پر ''مجلسِ یادگارِ قابل'' کے تحت اولین مجموعۂ کلام ''دیدۂ بیدار'' شائع ہوا۔ یہ اکتوبر ۱۹۶۳ء کی بات ہے (''دیدۂ بیدار'' قابل نے خود مرتب کیا تھا) بعدازاں اسی مجلس کی کاوشوں سے دوسرا شعری مجموعہ ''خونِ رگِ جاں'' ۱۹۶۶ء میں منظر عام پر آیا۔[۳۰] دونوں تصانیف کے ایڈیشن اب نایاب ہیں۔ فروری ۱۹۷۰ء میں ''دیدۂ بیدار'' کی دوبارہ اشاعت کا اہتمام کیا گیا اور ''طالب علم ڈائجسٹ'' نے باقاعدہ ''قابل نمبر'' کی صورت میں اسے شائع کیا۔ یہ ''قابل نمبر'' تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی حصے میں قابل اجمیری کے بارے میں لکھے گئے مختلف تنقیدی مقالات اور یادوں پر مبنی مضامین شامل ہیں۔ دوسرا حصہ شاعر کے کلام پر مبنی ہے۔ آخر میں قابل کی زمینوں میں لکھی گئی غزلوں کا ایک انتخاب شامل ہے۔ اس حصے کو ''طرحی مشاعرہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں یونی کیریز (عرب امارات) کے زیر اہتمام سلیم جعفری کی کاوشوں سے پہلی بار ''کلیاتِ قابل'' (نقوش پریس، لاہور) شائع ہوئی۔ کلیات کا ابتدائیہ شہزاد احمد نے تحریر کیا۔ حال ہی میں (اگست ۱۹۹۴ء میں) فرید پبلشرز، کراچی کے زیر انصرام کلیات بارِ دگر اشاعت پذیر ہوئی۔ پیش لفظ میں ظفر قابل رقم کرتے ہیں:

''مقام شکر ہے کہ قابل اجمیری کا مکمل کلام پہلی بار ''کلیاتِ قابل'' کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔''

یونی کیرنیز کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کلیات تشنہ اور نامکمل تھی۔ اس میں قابل کا خاصا کلام شامل نہ ہو سکا۔ ذیل میں ان نظموں اور غزلوں کی فہرست دی جا رہی ہے جو پہلی کلیات میں شامل نہیں تھیں مگر دوسری کلیات (فرید پبلشرز کراچی) میں شریک ہیں۔

نظمیں:

۱۔ ۱۴اگست ۲۔ آواز ۳۔ نقشِ حیات ۴۔ چاندنی رات ۵۔ عید کے دن

غزلیں:

۱۔ زندگی کا اعتبار نہ تھا
۲۔ غم ناگزیر ہے تو غمِ دو جہاں سہی
۳۔ برہم ہے کائنات مگر جی رہے ہیں ہم
۴۔ حوادث ہمسفر اپنے، تلاطم ہم عناں اپنا
۵۔ آج دل بے قرار سا کیوں ہے
۶۔ ہم تری رہگزر میں رہتے ہیں
۷۔ یاد بھی نامہرباں ہے آج کل
۸۔ جب گلوں کو صبا جگاتی ہے
۹۔ عام فیضانِ غم نہیں ہوتا
۱۰۔ غمِ دنیا و جورِ آسماں کچھ اور ہوتا ہے
۱۱۔ کیا ہوا ہے کہ ترے عشق کا سودا بھی نہیں
۱۲۔ وہ ہر مقام سے پہلے، وہ ہر مقام کے بعد

اس کلیات میں نہ صرف یہ کہ مندرجہ بالا کلام شامل کیا گیا ہے بلکہ ''باقیاتِ قابل'' کے تحت ان کی چار غزلیں اور نو نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ کلامِ قابل کے ضمن میں سب سے مستند اور قابلِ اعتبار حوالہ یہی کلیات ہے، اس لیے ذیل میں اس کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں تاکہ قابل کی شعری خدمات واضح طور پر سامنے آ سکیں۔

''کلیاتِ قابل'' (کراچی: فرید پبلشرز) چار حصوں پر مشتمل ہے۔ (ابتداء میں ظفر قابل کا ایک مختصر سا پیش لفظ بھی ہے) پہلے حصہ میں ''دیدۂ بیدار'' پر مبنی ہے۔ ''دیدۂ بیدار'' میں چھیاسٹھ (٦٦) غزلیں اور چھ (٦) نظمیں ہیں۔ علاوہ ازیں چھ (٦) رباعیات، پانچ (٥) قطعات اور متفرق اشعار بھی موجود ہیں۔ تیسرے حصے کا عنوان ''باقیاتِ قابل'' ہے۔ باقیات میں اٹھارہ (١٨) نظمیں، تین (٣) گیت اور ایک قومی نغمہ شامل ہے۔ اس حصے کے اختتام میں ''قابل کے کلام، فن اور شخصیت پر ہمعصروں کے تاثرات'' کے عنوان سے مختلف مشاہیر کی مختصر آراء درج ہیں۔ چوتھے اور آخری حصہ کا عنوان ''قضیۂ قابل'' ہے۔ اس سے مراد وہی اختلافی مشاعرہ ہے جس کا احوال بیان کیا جا چکا ہے۔ ''قضیۂ قابل'' کی ابتداء میں ڈاکٹر ساجد امجد کا سوانحی مضمون ''ایک عہد ساز اور جواں مرگ شاعر'' سہ بارہ شائع کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے یہ مضمون ماہنامہ ''سرگزشت'' اور روزنامہ ''قومی اخبار'' میں اشاعت پذیر ہو چکا تھا۔ اس مضمون کے مندرجات سے حمایت علی شاعر کو اختلاف تھا چنانچہ مذکورہ اخبار میں ان کا جواب مضمون قسط وار شائع ہوتا رہا۔ یہ مضمون بھی ''قضیۂ قابل'' میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں اس حصہ میں قابل اجمیری کی چند تصاویر اور بعض اخباری تراشے بھی شائع کیے گئے ہیں۔

قابل اجمیری صرف اکتیس سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ اس مختصر سے عرصۂ زیست میں انھوں نے اردو غزل کے سرمائے میں معیار اور مقدار کے اعتبار سے گراں قدر اضافے کیے۔ ان کے بیشتر اشعار ضرب المثل کا درجہ پا چکے ہیں۔ قابل کے کلام میں اتنی روانی، موسیقی اور ترنم ہے کہ ان کی بعض غزلوں کو معروف گلوکاروں نے اپنی ''نزاکتِ آواز'' سے آراستہ کیا ہے۔ ان ممتاز گلوکاروں کے نام یہ ہیں ـــ آشا بھوسلے، پنکھج ادہاس، اقبال بانو، مقبول صابری قوال، ڈاکٹر امجد پرویز، آصف علی وغیرہم۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قابل اجمیری اردو غزل کی ایک توانا آواز ہیں۔ اردو غزل کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے مستقبل کا نقاد انھیں فراموش نہیں کر سکے گا۔

حوالے:

١۔ ساجد امجد، ڈاکٹر ''جوہر قابل'' ماہنامہ سرگزشت، کراچی (اکتوبر ١٩٩٢ء) شمارہ: ١٢،

جلد:۲،ص۶۶

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً،ص۱۷

۴۔ فضل المتین،''قابل اجمیری''، ماہنامہ نخلستان، قابل نمبر جلد:۷،شمارہ:۴(جے پور: راجستھان اردو اکادمی)مارچ ۱۹۸۷ء،ص۱۲۷

۵۔ ایضاً

۶۔ طالب الہاشمی، مرتب، یاد رفتگاں، حصہ دوم (لاہور: حسنات اکیڈمی لمیٹڈ،س۔ن) ص۱۸۰۔۱۸۱

۷۔ ساجد امجد،ماہنامہ سر گزشت،ص۶۸

۸۔ فضل المتین،نخلستان،ص۱۱۵

۹۔ مشتاق احمد،خانزادہ''قابل اجمیری'' ماہنامہ طالب علم ڈائجسٹ،حیدرآباد،جلد:۲، فروری ۱۹۷۰ء،ص۵۶

۱۰۔ ظفر قابل (فرزند قابل) سے راقم کی گفتگو،سکھر:۲۷ جنوری ۱۹۹۵ء

۱۱۔ بیوہ قابل سے راقم کی گفتگو،سکھر:۲۷ جنوری ۱۹۹۵ء

۱۲۔ بیوہ قابل سے توصیف چغتائی کی گفتگو،طالب علم ڈائجسٹ،ص۹۵

۱۳۔ محسن بھوپالی،''چند یادیں'' طالب علم ڈائجسٹ،ص۱۰۲

۱۴۔ بیوہ قابل سے راقم کی گفتگو۔

۱۵۔ پندرہ روزہ کوھسار،کوئٹہ:۲۵ جون ۱۹۵۷ء

۱۶۔ بیوہ قابل سے توصیف چغتائی کی گفتگو،طالب علم ڈائجسٹ،ص۹۶

۱۷۔ میراجی،مشرق و مغرب کے نغمے (کراچی: آج کی کتابیں،۱۹۹۹ء)

۱۸۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،نفسیاتی تنقید(لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۸۶ء)

۱۹۔ بیوہ قابل سے توصیف چغتائی کی گفتگو

۲۰۔ ساجد امجد،ماہنامہ سر گزشت،ص۶۷

۲۱۔ ایضاً،ص۷۳

۲۲۔ حسن ظہیر" قابل اجمیری۔" ایک تاثر" طالب علم ڈائجسٹ،ص ۱۰۹
۲۳۔ خادمی اجمیری،" کچھ یادیں" طالب علم ڈائجسٹ،ص ۱۱۵
۲۴۔ بیوہ قابل سے راقم کی گفتگو
۲۵۔ ساجد امجد، ماہنامہ سرگزشت،ص ۷۷
۲۶۔ خادمی اجمیری،" کچھ یادیں" طالب علم ڈائجسٹ، ص ۱۱۴
۲۷۔ ایضاً،ص ۱۱۶
۲۸۔ نظر کامرانی،" قابل۔ایک غزل گوشاعر" طالب علم ڈائجسٹ،ص ۸۱
۲۹۔ کریم الدین،ڈاکٹر،طالب علم ڈائجسٹ،ص ۳۵
۳۰۔ ظفر قابل، پیش لفظ کلیات قابل (کراچی: فرید پبلشرز، اگست ۱۹۹۴ء)

○

مسز شوکت نوٹس

P.III
اردو ادب بیسویں صدی

۲۔ قابل اجمیری کی غزل

قابل اجمیری ایک خوش فکر اور نغز گو شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی پہچان کا بنیادی حوالہ غزل ہے۔ انھوں نے یوں تو دیگر اصنافِ سخن مثلاً نظم، رباعی، قطعہ وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی، لیکن ان کے جوہر غزل ہی میں کھلتے ہیں۔ غزل قابل کی پہلی محبت ہے۔ انھوں نے شاید اپنے حوالے سے کہا تھا:

ع محبت کی غزل پر زندگانی رقص کرتی ہے

اگر ''کلیاتِ قابل'' کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ کلیات کا دو تہائی حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ یوں دیگر اصناف کا تناسب بہت کم ہے۔ اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ قابل اجمیری اول و آخر غزل کے شاعر ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مزاج اور طبع کو غزل کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے۔

قابل نے بہت نوعمری ہی میں شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ ابتداء میں شاہ عبدالرحیم ارمان اجمیری کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہو کر مشقِ سخن کی۔ بعدازاں ارمان سے رشتۂ تلمذ منقطع کر کے مولانا معنی اجمیری سے رجوع کیا۔ مولانا کے فیضِ صحبت سے قابل کی شاعری کو حیاتِ نو ملی۔ قابل نے بہت کم عرصے کیلئے ان اساتذہ سے اصلاحِ سخن لی۔ اپنے فطری جوہر اور جودتِ طبع کے باعث وہ جلد اس مقام پر پہنچ گئے کہ اساتذہ بھی انھیں رشک کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

قابل کے ہاں روایت کا گہرا شعور ملتا ہے۔ انھوں نے کلاسیکی شاعری کا بغور مطالعہ کیا اور اسے حرزِ جاں بنالیا۔ وہ غزل کے مزاج آشنا تھے۔ ان کے ہاں روایتی مضامین بکثرت ہیں، لیکن انھوں نے اپنی جدتِ طبع سے کام لیتے ہوئے روایت میں اضافہ بھی کیا۔ ان کی شاعری میں روایت پس منظر کا کام کرتی ہے۔ فرمان فتح پوری کے بقول:

''قابل اجمیری میں نکتہ سے نکتہ پیدا کر لینے، خیال روشن کر لینے اور روایت سے تازہ روایت کو جنم دینے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ ان کی طبیعت میں بلا کی جدت و لطافت اور ان کے احساس میں غضب کی تازگی وانفرادیت ہے۔''[۱]

ایک اور نقاد نربھے رام جوہر نے بھی اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے:

''(قابل اجمیری) نے اپنے فکر وفن کیلئے ایک جانب تو ماضی سے استفادہ کیا اور دوسری جانب حال اور مستقبل کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے شعور کی رو کو فن کے پیکر میں سمو دیا۔''[۲]

قابلؔ نے روایت سے خاطر خواہ اکتساب کیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ تازگی اور جدت کی طرف بھی توجہ دی۔ انھوں نے پرانے موضوعات کو خوبی سے ادا کیا لیکن وہ ہمہ وقت نئے مضامین اور تازہ خیالات کی جستجو میں رہتے تھے۔ قابل سخن گوئی میں تقلید کے قائل نہیں، بلکہ اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے آرزومند ہیں۔ اگر چہ وہ اکثر و بیشتر قدیم موضوعات کی بنیاد پر اپنی شاعری کا محل تعمیر کرتے ہیں تاہم جدید رجحانات سے بھی غافل نہیں رہتے۔ وہ نئے رجحانات اور تازہ امکانات سے اس محل کی آرائش وزیبائش کا کام لیتے ہیں۔ وہ غزل کی صنف کو وسیع کرنے کے خواہاں تھے، اس لیے ان کے ہاں وسعت اور کشادگی کا خوشگوار احساس ملتا ہے۔ نربھے رام جوہر اردو غزل کی روایت کے پس منظر میں قابل کی شاعری کا جائزہ یوں لیتے ہیں:

''قدیم شعراء کے یہاں ہمیں سازِ غزل سے چند مخصوص آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ان آوازوں میں کبھی ہجر و وصال کی باتیں، کبھی جنون و خرد کے افسانے، کبھی ساغر مینا کی چھنک، کبھی بہار خزاں کی اٹھکیلیاں، کبھی حسن وعشق کی حشر سامانیاں اور کبھی دیر و حرم کے راز و نیاز کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ قابل نے ان آوازوں کو نہ صرف خلوصِ دل سے قبول کیا بلکہ اپنے عروسِ خیال کو ان سے سجایا بھی سنوارا بھی۔ یہی وجہ ہے کہ قابل کے یہاں نئے چراغوں کے ساتھ ساتھ پرانے چراغ بھی ضوفشاں ہیں کہ جن کو قابل نے اپنے اندازِ اظہار کی ندرت سے ایک انوکھا نکھار عطا کیا۔''[۳]

قابلؔ اجمیری کے بنیادی موضوعات کم وبیش یہی ہیں جو مذکورہ بالا اقتباس میں بیان ہوئے ہیں لیکن وہ مضامینِ نو کی تلاش میں بھی رہتے تھے۔ انھیں لمحۂ موجود کی اہمیت کا احساس تھا۔ وہ اپنے زمانے کے آشوب سے آگاہ تھے اور حال اور مستقبل پر نظر رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں

عصری شعور کی رو دوڑتی نظر آتی ہے۔ وہ غزل کے پیرائے میں اپنے عہد کے کرب اور حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور علامتی انداز اختیار کرتے ہوئے معاشرتی مسائل اور استحصالی قوتوں کو غزل کے آہنگ میں بے نقاب کرتے ہیں۔ غزل کے پیکر کو برقرار رکھتے ہوئے معاشرت اور سیاست پر تبصرہ کرنے کا فن انھوں نے شاید فیض احمد فیض سے سیکھا تھا۔ قدرت نے قابل کو اخذ و استفادہ کی بے پناہ دولت سے نواز تھا۔ ان کی طبع نے ہر استاد سے فیض حاصل کیا۔ ان اساتذہ میں جگر مراد آبادی، حسرت موہانی اور فراق گورکھپوری وغیرہ شامل ہیں۔ قابلؔ کے کلام میں ان اہم شعراء کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، لیکن وہ اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھتے ہیں۔ قدرت اگر فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھیں مہلتِ زیست بھی عطا کرتی تو قابل کا شمار شاید ان اساتذہ کی فہرست میں ہوتا۔ کریم الدین احمد کے بقول:

''مجھے نہ جانے کیوں احساس ہوتا ہے کہ وہ آہنگ کی تلاش میں تھے، آواز والفاظ کے سوتے جہاں سے پھوٹتے ہیں وہ وہاں تک پہنچنا چاہتے تھے اور ابھی وہ اپنی منزل پہ نہ پہنچے تھے کہ موت نے انھیں جالیا۔''[۴]

یہ درست ہے کہ قابل ابھی فن کی دنیا میں محوِ سفر تھے اور منزل یاب نہ ہو سکے تھے۔ اجل نے غزل سے ایک بڑا شاعر چھین لیا لیکن موت قابل سے ان کا وہ مرتبہ نہ چھین سکی جو انھوں نے اپنی مختصر سی زندگی میں حاصل کر لیا تھا۔ اس مقام کے بارے میں فرمان فتح پوری تبصرہ کرتے ہیں:

''یہ کوئی معمولی منصب نہیں۔ اس منصب تک پہنچتے پہنچتے لوگ خون تھوکنے لگتے ہیں۔ خود قابل کو دیکھ لیجیے کہ وہ اس منصب تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ گیا۔''[۵]

گزاری نزع کے عالم میں تو نے عمر اے قابلؔ
ترے شعروں میں لیکن زندگانی رقص کرتی ہے

قابل اجمیری نے غزل جیسی مشکل صنفِ سخن میں ''رتبۂ بلند'' حاصل کیا۔ اس مشکل صنف کے بارے میں فرمان فتح پوری کی رائے ہے کہ:

''غزل ہمارے ادب کی مقبول ترین صنف سہی لیکن کہنے والے جانتے ہیں کہ بڑی جان لیوا ہے، آسانی سے قابو میں نہیں آتی، بڑی چنچل اور نازک صنفِ سخن ہے۔ حد درجہ سادہ و پرکار،

بظاہر بے خود بباطن ہوشیار، بڑی حیاکوش ونفاست پسند، پرتکلف و پراسرار، بے محابا نہیں رفتہ رفتہ کھلتی ہے، گفتار نرم، رفتار سبک، مزاج متلون، درونِ خانہ کے ہنگاموں کا شکار، خارجی حقائق کی رازدار، لیکن طرزِ اظہار میں حددرجہ آزاد ومحتاط چنانچہ خیالات وافکار کتنے ہی جدید ودقیق یا لطیف و نازک کیوں نہ ہوں، وہ اپنے مخصوص علامتی اور اجمالی انداز کے سوا کسی اور طرح بیان کرنا پسند نہیں کرتی۔ بات یہ ہے کہ غزل دراصل کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی پیدا کردینے کا فن ہے۔[۶]

فرمان فتح پوری نے نہایت خوبصورت اسلوب میں غزل کہنے کی شرائط بیان کی ہیں۔ ان کے خیال میں قابل اجمیری ایک ایسے غزل گو ہیں جو ان کڑی شرائط پر پورا اترتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کے بقول: ''دوشیزۂ غزل نے اپنے سب اسرار اس پر کھول دیئے تھے۔''[۷]

دوشیزہ غزل کا سب سے اہم ''راز'' حسن وعشق ہے۔ قابل اجمیری نے معاملات حسن و عشق کو نفسیاتی بصیرت اور ذاتی تجربات کی روشنی میں ادا کیا ہے۔ انھیں زندگی میں ایک بار ناکام محبت کا تجربہ حاصل ہوا تھا۔ اس تجربے نے ان کی شاعری میں سوز وگداز کی کیفیت پیدا کردی ہے۔ ان کی غزل میں عشق کی کیفیات اور احساسات روایتی طور پر بیان نہیں ہوئیں بلکہ اس کے پس منظر میں ایک خالص عشقیہ تجربہ موجود ہے۔ اس ناکام جذباتی واردات کے باعث ان کے یہاں شدتِ احساس اور جذبہ کی گہرائی نظر آتی ہے۔ قابل ان الفاظ میں اقرارِ محبت کرتے ہیں:

حدیث کاکل و رخسار ہم بھی رکھتے ہیں
کوئی سنے تو غمِ یار ہم بھی رکھتے ہیں

ہمیں بھی شہرِ نگاراں میں لے چلو، یارو
کسی کے عشق کا آزار ہم بھی رکھتے ہیں

قابل کے نزدیک عشق لازمۂ حیات ہے۔ محبت کے بغیر انسان کی زندگی بے کیف اور بے رونق ہے۔ یہ عشق ہی ہے جو زندگی کو زندگی کے راز سکھلاتا ہے اور انسان پر زندگی کا مفہوم عیاں کرتا ہے۔ قابل انسانی حیات میں محبت کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تم نہ مانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے

محمود ہاشمی نے اس شعر کی شرح یوں کی ہے:

''ضرورت'' کا لفظ ایک لازمی عنصر کو ظاہر کرتا ہے۔ عشق اور انسان کو لازم و ملزوم سمجھنا اس کا شاہد ہے کہ قابلؔ نے انسان کی فکر، ارتقاء اور اس کے احساس کے اجزائے ترکیبی کی تحقیق کی ہے۔ عشق اور انسان کی تطبیق اس کے احساس کی زندگی اور جلا ہے۔ عشق انسان کی مسرت، امید، اطمینان اور اپنی شخصیت کے ادراک کا بنیادی عنصر ہے۔ یہ نہ محض فلسفہ ہے اور نہ مذہب، نہ یہ جنسی ہیجان کا منبع ہے اور نہ کوئی جمالیاتی قدر جسے ہم فنی تخلیق کیلئے لازمی قرار دیتے ہیں۔ عشق تو انسان کی ضرورت ہے اور ''لازم'' میں اس کے تمام عناصر کا مرکب موجود ہے۔ ہر معیاری انسان کیلئے قابلؔ اسے اسی لیے لازم قرار دیتے ہیں۔''[۸]

قابلؔ کی غزل میں عشق کا ایک تہذیب یافتہ تصور نظر آتا ہے۔ یہ ایک شائستہ اور مہذب انسان کا عشق ہے جس میں سطحیت اور سوقیانہ پن بالکل نہیں ہے۔ جن کیفیات واردات کو انھوں نے شاعری کا موضوع بنایا ہے، وہ ایک متوازن اور باشعور فرد کی کیفیات وواردات ہیں۔ بینش سلیمی کے الفاظ ہیں:

''تہذیب وشائستگی، ظرف وضبط، توانائی اور توازن کی ایک عجیب دلکش اور پرتاثیر فضا ان کے کلام میں پائی جاتی ہے جس میں ابتذال، سطحیت اور تقلید کا شائبہ تک نہیں۔''[۹]

نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نظر نظر میں ہے کامرانی، قدم قدم پر ہے کامیابی
مگر کوئی مسکرا کے دیکھے تو ہار جانا بھی جانتا ہوں

حیرتوں کے سلسلے سوزِ نہاں تک آ گئے
ہم نظر تک چاہتے تھے تم تو جاں تک آ گئے

کسی کی زلف پریشاں، کسی کا دامن چاک
جنوں کو لوگ تماشا بنائے پھرتے ہیں

آخری شعر میں قابؔل نے معنی خیز انداز میں زلفِ پریشاں اور چاکِ گریباں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔اس طرز کا مضمون اردو شاعری میں کہیں بیان نہیں ہوا۔اس شعر پر فرمان فتح پوری کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

علامہ اقبال نے ایک فارسی شعر میں البتہ کہا تھا:

باچنیں ذوقِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
درجنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

بہت ممکن ہے قابل اجمیری کی نظر سے یہ شعر گزرا ہواور دیوانگی بشرطِ فرزانگی کا خیال انھوں نے یہیں سے لیا ہو،لیکن انھوں نے جس سادگی، دلکشی اور طنزیہ لہجے میں اس خیال کو ایک نیا رخ دے دیا ہے،وہ کم از کم اردو شاعری میں بالکل نئی چیز ہے۔ مجھے یقین ہے یہ شعر اپنی برجستگی، شگفتگی اور معنوی جدت کے سبب بہت جلد ضرب المثل بن جائے گا اور اس کا نفسِ مضمون یا تاثر جو سرِدست بغاوت کی حیثیت رکھتا ہے،غزل میں ایک نئی روایت کو جنم دے گا۔''[۱۰]

قابؔل کی شاعری کا سب سے نمایاں پہلو عشق اور اس کی جملہ کیفیات واحساسات کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔وہ دلکش آہنگ میں عاشق کی ''تحلیلِ نفسی'' کرتے ہیں اور دل پر گزرنے والی حالتوں کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کے نزدیک عشق ایسی ''پیاس'' ہے جس کا مداوا ہر بھی نہیں کرسکتا۔وہ محبت میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے چنانچہ محبوب کو بھی محبت سے کم کم دیکھتے ہیں۔

قابؔل کے خیال میں اگر نگاہِ دوست پہ اظہارِ بیکسی ہو جائے تو جذبۂ محبت فنا ہو جاتا ہے۔وہ جنوں کے تماشا بنانے کو زمانہ سازی سے تعبیر کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ مقامِ عاشقی چاک گریبانی اور پریشانئ زلف سے ماورا ہے۔ قابؔل کے نزدیک محبت دردِ سر نہیں بلکہ یہ زندگی بسر کرنے کا ایک منشور ہے:

محبت کی حقیقت کھل گئی چاکِ گریباں سے
جنوں بھی ایک منزل میں زمانہ ساز ہوتا ہے

آنکھوں میں فقط آنسو، ہونٹوں پہ فقط آہیں
اندازِ جنوں دل کو اب تک نہیں آیا ہے

دل رسم و رہِ شوق سے مانوس تو ہو لے
تکمیلِ تمنا کے لیے عمر پڑی ہے

قابلؔ نے وارداتِ قلبی کی مختلف صورتوں کو نفسیاتی بصیرت اور عمیق مشاہدے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کا فلسفۂ عشق منفرد انداز کا حامل ہے۔ وہ عشق کو نئے تیور دینے کیلئے محبوب سے بھی گریزاں ہو جاتے ہیں۔ قابل کے عشق میں طرزِ دلربائی اور شانِ محبوبیت پائی جاتی ہے۔ وہ محبت میں انا اور خودداری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے:

پیغامِ حضوری نہیں آتا تو نہ آئے
ہم سے بھی طوافِ درِ جاناں تو نہ ہو گا

انانیت کا یہ گہرا احساس غالبؔ کی یاد دلاتا ہے۔ دراصل قابل روایت کے بطن سے تازہ امکانات پیدا کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ اپنی ''روشنیٔ طبع'' کی مدد سے چراغ سے چراغ روشن کر لیتے تھے۔ غالبؔ نے کہا تھا:

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

قابلؔ نے اس خیال کو ایک اور زاویے سے دیکھا ہے:

رکا رکا سا تبسم، جھکی جھکی سی نظر
تمھیں سلیقۂ بیگانگی کہاں ہے ابھی

قابلؔ اجمیری معاملاتِ حسن و عشق کو ایک ماہرِ نفسیات کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے

ایک طرف عشق کی کیفیات و واردات کو موضوعِ سخن بنایا ہے تو دوسری جانب محبوب کی ذہنی کشمکش سے بھی لاتعلق نہیں رہتے۔ زندگی کے مسائل کی طرح حسن کی بعض کیفیات کا انھوں نے گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ ''قابلؔ نے حسن کے بعض ایسے پہلوؤں پر نگاہ ڈالی ہے جس کی طرف شاید اس انداز سے کسی نے دیکھا نہیں اور اگر دیکھا بھی تو اس برجستگی اور اثر آفرینی کے ساتھ رقم نہیں کیا۔''[۱۱]

عشق کے ہاتھوں محبوب کے دل پر گزرنے والی متغیر اور متنوع کیفیات واحساسات کو قابلؔ خوب سمجھتے ہیں۔ وہ حسن کے مزاج شناس ہیں۔ قابلؔ کے تصورِ محبوب میں ایک بانکپن موجود ہے۔ یہ تصور بیک وقت روایت سے بھی منسلک ہے اور اس میں جدت کی شان بھی ہے۔ قابلؔ محبوب کے ظاہری حسن کا نقشہ نہیں کھینچتے اور نہ ہی جمالِ محبوب کے مختلف مظاہر کو بیان کرتے ہیں۔ وہ محبوب کے پیکر کے خطوط کی طرف توجہ نہیں دیتے بلکہ حسن کی اداؤں، ناز و انداز اور مزاج کی تصویر کشی کرتے ہیں:

بے نیازی کو اپنی خُو نہ بنا
یہ ادا بھی کسی کو پیاری ہے

ہو کے رہ جاتا ہے اپنی ہی اداؤں میں اسیر
حسن شائستۂ اربابِ نظر ہونے تک

ان کے حسنِ ستم کا کیا کہنا
لوگ سمجھے خطا ہماری ہے

قابلؔ کے ہاں یکطرفہ محبت کا تصور نہیں بلکہ ان کا محبوب چپکے چپکے دل ہی دل میں اپنے عاشق کیلئے انسیت کا جذبہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ عاشق کی جرأتِ اظہار پہ خفا بھی ہوتا ہے، لیکن اپنی جفاؤں پر ندامت کا احساس بھی اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ محبوب عاشق کی حالت زار کے باعث پریشان اور پشیمان رہتا ہے اور اپنے چاہنے والے کیلئے دل میں جذبۂ ہمدردی رکھتا ہے:

نگاہِ یار برہم ہو تے ہوتے
مزاجِ گلستاں ہو جائے گی کیا

مرے جنوں کا تماشا تو سب نے دیکھ لیا
تری نگاہِ پشیماں کی بات کون کرے

اس کے جلوے بھی پشیمان ہوئے جاتے ہیں
دوستو، حسرتِ دیدار پہ کیا گزری ہے

نئی نئی ہے محبت، نیا نیا ہے خلوص
سنبھل سنبھل کے نگاہیں ملا رہا ہے کوئی

جدید اردو غزل میں فراقؔ گورکھپوری کے ہاں حسن کی نفسیات کی شاعرانہ پیشکش ہوئی ہے۔ نئی غزل نے فراقؔ کے بعض اثرات قبول کیے ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد میں متعدد شعراء کو براہ راست متاثر کیا۔ قابلؔ کے ہاں بھی فراقؔ کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ خصوصاً حسن کی نفسیاتی کیفیت کو سمجھنے میں وہ فراقؔ کا انداز اختیار کرتے ہیں تاہم اس ضمن میں اپنی انفرادیت بھی قائم رکھی ہے۔ فراقؔ کا ایک شعر دیکھیے:

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست!
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

قابلؔ نے وصال سے قبل کی تصویر کشی کی ہے:

جمالِ دوست کو پیہم نکھرنا ہے، سنورنا ہے
محبت نے اٹھایا ہے ابھی پردہ کہاں اپنا

فراقؔ کے مذکورہ شعر (اور دیگر کلام) کی روشنی میں یہ پہلو نمایاں ہوتا ہے کہ وہ محبوب کو

دوست کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اردو شاعری میں محبوب کیلئے یہ خطاب قدرے نئی چیز ہے۔ بعد میں اس ''خطاب'' کو دیگر شاعروں نے بھی استعمال کیا، جن میں ناصر کاظمی کا نام اہم ہے:

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

فراقؔ گورکھپوری کے زیر اثر قابلؔ اجمیری بھی محبوب کو دوست کہہ کر ہمکلام ہوئے ہیں:

دشوار نہیں عرضِ تمنا مگر اے دوست
تو اپنی توجہ پہ پشیماں تو نہ ہو گا

قابلؔ کے کلام میں اس طرح کی خاصی تراکیب ملتی ہیں، جن میں بنیادی لفظ ''دوست'' ہے مثلاً رضائے دوست، جمالِ دوست، نگاہِ دوست، غرورِ دوست وغیرہ

دورِ حاضر پر فراقؔ کے خاصے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ان کی ایک مقبول غزل کی زمین پر بہت سے شعراء نے طبع آزمائی کی، لیکن فراقؔ کے آگے کسی کا چراغ روشن نہ ہو سکا۔ اس کی غزل کا مطلع ہے:

سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

قابلؔ نے بھی اس زمین میں غزل کہی لیکن وہ کوئی انفرادیت یا تازگی پیدا نہ کر سکے۔ غزل کا مطلع ملاحظہ ہو، جس پر فراقؔ کے مطلع کا پرتو جھلک رہا ہے:

کیا ہوا ہے کہ ترے عشق کا سودا بھی نہیں
زندہ رہنے کیلئے کوئی تمنا بھی نہیں

دراصل فراقؔ نے اپنے تخلیقی وفور کے ساتھ شعر کہے ہے کہ بعد میں آنے والے سخنوروں کو مشکل کا سامنا کرنا پڑا البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ قابلؔ نے ایک آدھ شعر ضرور ایسا کہا ہے جو

اپنی جانب توجہ مبذول کراتا ہے۔ ان کا ایک خوبصورت شعر دیکھیے:

حیرتیں کہتی ہیں وہ آ کے گئے بھی کب کے
ذوقِ نظارہ پشیماں ہے کہ دیکھا بھی نہیں

تخلیق کاری کے ضمن میں یہ پہلو اہم ہے کہ امکانات کی دنیا بہت وسیع ہے۔ امکانات کبھی معدوم نہیں ہوتے۔ عہد حاضر کے ایک شاعر اسلم انصاری نے فراقؔ کی زمین میں البتہ کامیاب غزل کہی ہے جس کا مطلع یہ ہے:

میں نے روکا بھی نہیں، اور وہ ٹھہرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا جسے دل نے بھلایا بھی نہیں

فراقؔ سے بہت پہلے غالبؔ کے ہاں نفسیاتِ حسن کا بہت اعلیٰ فنکارانہ اظہار ملتا ہے۔ غالبؔ کا ایک شعر دیکھیں:

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی دادیاں

قابلؔ نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے:

مری طرح ہوئی تو ہیں تنہائیاں عزیز
اپنی ہی شوخیوں سے کوئی سرگراں سہی

قابلؔ ایک ذہین شاعر تھے اور چراغ سے چراغ جلانے میں ماہر۔ انھوں نے غالبؔ سے بھی کسبِ فیض کیا (اور کس نے غالبؔ سے کسبِ فیض نہیں کیا؟) ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو، جو غالبؔ کی یاد دلاتا ہے:

مرحلے زیست کے بھی کم تو نہیں ہیں اے دوست
اور جی لیں گے تری زلف کے سر ہونے تک

اسی طرح قابلؔ کا ایک اور شعر دیکھیے۔

شمعیں روش روش پہ فروزاں کیے ہوئے
دشواریاں ہیں زیست کو آساں کیے ہوئے

یہ غزل بھی غالبؔ کی ایک غزل کی یاد دہانی کا باعث بنتی ہے:

ع مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

لطف کی بات یہ ہے کہ قابلؔ کے مذکورہ شعر کے مصرعِ ثانی سے اصغرؔ گونڈوی کا ایک مصرع ذہن میں آتا ہے اور یوں نشہ ''دوآتشہ'' ہو جاتا ہے:

ع اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اور غالبؔ نے بھی تو کہا تھا:

ع مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

غالبؔ کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

قابلؔ نے غالب کے ایک خیال سے دو مختلف مضمون پیدا کیے ہیں:

لالہ و گل کے روپ میں کیا کیا
رنگ لائی ترے قدم کی خاک

مقاماتِ فکر و نظر کون سمجھے
یہاں لوگ نقشِ قدم دیکھتے ہیں

مضمون کی یہ دو مختلف صورتیں اس امر کی جانب اشارہ کرتی ہیں کہ قابلؔ اکتساب اور استفادے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے تھے۔

یاد—— فسانہ عشق کے ایک اہم باب کا عنوان ہے۔ ہجر و فراق کے اداس لمحوں میں تصورِ جاناں عاشق کیلئے غم گسار بھی ہوسکتا ہے اور باعثِ آزار بھی۔ کسی کی یاد مہربان بھی ہوسکتی ہے اور بے رحم بھی۔ قابلؔ اجمیری کے ہاں یاد آفرینی کے حوالے سے دونوں ممکن صورتیں نظر آتی ہیں تاہم انھوں نے رجائی اور نشاطیہ پہلو کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ وہ محبوب کی یاد کو مسیحا قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی کی یاد چاندنی کی طرح نرم، پھول کی مانند رنگین اور ساغر کی طرح کیف آور ہے۔ یاد—— قابلؔ کی غزل کا ایک اہم موضوع ہے۔ ان کے کلام میں ایک مکمل غزل ''تیری یاد'' کی ردیف میں ملتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک غزل کی ردیف ''تو یاد ہوں گے'' ہے۔ ذیل میں چند شعر دیئے جا رہے ہیں۔ جو ''یاد'' کی متنوع صورتوں کو بیان کرتے ہیں:

دل کی وادی میں چاندنی کی طرح
پھیلتی جا رہی ہے تیری یاد

تمہیں بھی آغازِ دوستی کے حسین نظارے تو یاد ہوں گے
جو اپنی الفت کے رازداں تھے وہ چاند تارے تو یاد ہوں گے

زندگی اتنی دلفریب نہ تھی
تم مگر مجھ کو یاد آتے رہے

تمہاری یاد کو آرام جاں بنایا تھا
تمہاری یاد بھی لیکن کبھی کبھی آئی

ہوا تھا ہجر کا احساس لمحہ بھر کیلئے
پھر اس کے بعد تری یاد عمر بھر آئی

مجھے تو اس درجہ وقتِ رخصت سکوں کی تلقین کر رہے ہو
مگر کچھ اپنے لیے بھی سوچا، میں یاد آیا تو کیا کرو گے؟

تضاد ـــ شاعری کی ایک خصوصیت ہے۔ یہ تضاد کبھی کیفیات و جذبات کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے اور کبھی الفاظ وتراکیب میں اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ قابلؔ کے کلام کا ایک وصف یہی ''تضاد'' ہے۔غیاث الدین قریشی کے بقول:

''قابلؔ کی شاعری کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کے اشعار میں متضاد الفاظ، متضاد کیفیات اور متضاد جذبات کا نہایت موثر اور دلفریب استعمال نظر آتا ہے۔''[۱۲]

قابلؔ کے ہاں ''تضادِ جذبات'' کی نازک کیفیات کی صورتیں دلکش اسلوب میں بیان ہوئی ہیں خصوصاً جب وہ رونے اور ہنسنے کی متضاد کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہیں تو ان کی ہنرمندی عروج پر نظر آتی ہے۔ سحر انصاری اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''قابلؔ کی شاعری میں شعلہ و شبنم بلکہ شبنم وطوفان کی سی متضاد کیفیات بھی ملتی ہیں۔''[۱۳]

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قابلؔ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی سوغاتیں ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ ہونٹوں پہ مسکراہٹوں کے خزانے بھی موجود ہیں۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تضادِ جذبات میں یہ نازک مقام آیا تو کیا کرو گے
میں رو رہا ہوں تو ہنس رہے ہو میں مسکرایا تو کیا کرو گے

ان کی پلکوں پر ستارے، اپنے ہونٹوں پر ہنسی
قصۂ غم کہتے کہتے ہم کہاں تک آ گئے

ہونٹوں پہ ہنسی، آنکھ میں تاروں کی لڑی ہے
وحشت بڑے دلچسپ دوراہے پہ کھڑی ہے

اس آخری شعر کو پڑھ کر غالبؔ کی یاد آتی ہے:

شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

قابلؔ نے شاید غالبؔ کے شعر کو پیش نظر رکھتے ہوئے سادہ اسلوب میں ایک متضاد کیفیت کا

اظہار کیا ہے۔ اس موقع پر منیر نیازی کا ایک مطلع (زمین اور بحر کے اشتراک کے باعث) بے اختیار نوکِ قلم پر آ گیا ہے:

یہ لڑکی جو اس وقت سربام کھڑی ہے
اڑتا ہوا بادل ہے کہ پھولوں کی لڑی ہے

وقت کا مسئلہ ابتداء ہی سے شعراء کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اردو شاعری میں بھی نقطۂ نظر کے فرق کے ساتھ مختلف شاعروں نے اس مسئلے کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ خصوصاً اردو نظم میں وقت کے تصور کے حوالے سے خاصا مواد ملتا ہے۔ مختلف نظم گو شعراء وقت کے مسئلے کو اپنی شاعری میں زیر بحث لائے ہیں۔ ان میں علامہ اقبال، ن م راشد، مختار صدیقی، مجید امجد، ضیاء جالندھری وغیرہ اہم ہیں۔ ایک غزل گو کی حیثیت سے قابلؔ اجمیری نے بھی وقت کا تصور پیش کیا ہے۔ وہ وقت کو عشق کے آئینہ میں دیکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں اس حوالے رومانوی نقطۂ نظر موجود ہے۔ ان کے ہاں وقت گزرنے کا احساس نمایاں ہے، لیکن یہ احساس کسی کرب یا زیاں سے عبارت نہیں۔ ان کے خیال میں ہجر کی رات ہو یا صبحِ نشاط، وقت بہر حال اپنی خاص رفتار سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔

کٹ گئے ہجر کے پہاڑ سے دن
وقت کو تیرا انتظار نہ تھا

وقت کے زخم سل بھی جاتے ہیں
عمرِ رفتہ پلٹ بھی آتی ہے

جبینِ وقت کو ہم نے بھی نور بخشا ہے
سلیقۂ نگہِ یار ہم بھی رکھتے ہیں

قابلؔ وقت کی جبریت کے خلاف نبرد آزما بھی ہوتے ہیں اور اس پیکار میں یقینِ محکم اور عملِ پیہم کو بروئے کار لاتے ہیں۔

کر رہا ہوں جہادِ زندگی
وقت میری داستاں ہے آج کل

ہم چراغِ یقیں جلاتے رہے
وقت کو راستہ دکھاتے رہے

سلسلۂ روز وشب میں جو حادثات پیش آتے ہیں، قابل نے انھیں ایک مفکر کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کی ہے:

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

قابلؔ نے چند لفظوں میں زندگی میں پیش آنے والے حادثات کا فکری سطح پر تجزیہ کیا ہے۔ اس شعر کو اگر تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو اس کی معنویت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہم دور نہیں جاتے، مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب پر غور کر لیتے ہیں۔ یہ زوال کوئی ایک دن میں وقوع پذیر نہیں ہوا تھا بلکہ اس میں برسوں کی ''محنت'' شامل ہے۔

قابلؔ کی غزل کا بنیادی مرکز عشق ہے۔ دیگر موضوعات اس محور کے گرد گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ عشق کا سرچشمہ ان کی غزل کو تغزل کا حسن عطا کرتا ہے۔ احساسِ جمال سے ان کی شاعری میں وہ خوبی پیدا ہوئی ہے، جسے اہلِ نظر ''شعریت'' کہتے ہیں۔ بینش سلیمی کے بقول:

''شاعر کا مذاقِ جمالیات...... غزل کو وہ رنگ دیتا ہے جسے ہم تغزل، غزلیت یا شعریت کہتے ہیں۔''[۱۴]

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنا ہوگی کہ قابل کی شاعری صرف فسانۂ حسن و عشق کا بیان نہیں۔ وہ غزل کے اس محبوب موضوع سے گریز کرتے ہوئے زندگی کی دیگر صورتوں اور حالتوں کی طرف بھی متوجہ ہوئے ہیں۔ انھیں یہ احساس تھا کہ زمانے میں محبت کے سوا اور بھی کئی طرح کے دکھ ہیں جنھیں شعر کے پردے میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قابلؔ کے پاس موضوعات

کا فقدان نہیں ہے۔ وہ غزل میں محدودیت کے قائل نہیں۔ اس لیے ہمیں ان کی شاعری میں وسعت دکھائی دیتی ہے۔ ان کے کلام میں ناقدریٔ عالم کی شکایت بھی ہے اور فریبِ دوستاں کا احوال بھی، وہ میکدے کی داستان بھی بیان کرتے ہیں اور گردشِ دوراں کی کہانی بھی سناتے ہیں، ان کے یہاں غمِ روزگار کا تذکرہ بھی ہے اور عصری آگہی کا بیان بھی — یہ وہ مضامین ہیں جن سے قابل کی غزل کا دامن آباد ہے۔

قابل نے ایک شکست خوردہ انسان کی طرح فریبِ دوستاں کا حال نقل کیا ہے، لیکن اس موضوع کے بیان میں وقار، متانت اور ظرف کا دامن تھامے رہتے ہیں۔ وہ تھکے تھکے لہجے میں دوستوں کی بیوفائی کا ذکر کرتے ہیں، لیکن ان کا لب ولہجہ شکایتی نہیں ہوتا۔ احباب کے فریب کے باوجود وہ ان سے توقعات وابستہ رکھتے ہیں۔ کبھی کبھار وہ دوستی کے باب میں اپنی وفاداری بھی جتلاتے ہیں۔

کوئی احسان کر کے قابل پر
دوستی کی سزا نہ دے جانا

احباب کے فریبِ مسلسل کے باوجود
کھنچتا ہے دل خلوص کی آواز پر ابھی

خیالِ خاطرِ احباب اور کیا کرتے
جگر پہ زخم بھی کھائے، شمار بھی نہ کیا

یہ آخری شعر میر انیس کے اس شعر کی توسیع ہے جو اب ضرب المثل کا درجہ حاصل کر چکا ہے:

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

قابل احباب کی بے مہری کے خلاف احتجاج نہیں کرتے بلکہ "سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب

کھائے جا'' کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ حضور احمد سلیم کے بقول'' قابل روز و شب آنے والے زندگی کے فریبِ مسلسل سے اغماض اور چشم پوشی کرکے ایک باشعور اور حساس فرد کا مثبت ردِ عمل پیش کرتے ہیں۔ وہ نہ شکوہ سنج ہوتے ہیں۔ نہ حرفِ شکایت زبان پر لاتے ہیں۔''[۱۵] ان کا یہ مثبت طرزِ عمل دیکھ کر کبھی کبھار دشمن بھی نادم ہو جاتا ہے۔

احباب کی بلندیٔ اخلاق دیکھ کر
دشمن بھی ہو گیا ہے پشیماں کبھی کبھی

قابل کے ہاں احباب کے تغافل کا موضوع وسعت اختیار کرتے ہوئے'' ناقدریٔ عالم'' کا مضمون بن گیا ہے۔ احباب یا افراد کے مجموعے سے معاشرہ یا زمانہ تشکیل پاتا ہے۔ قابل کے کلام میں ایسے بہت سے شواہد ملے ہیں، جن میں زمانے کی تلخیوں اور ناانصافیوں کا ذکر ہے۔ انھوں نے زمانے کی ناسپاسی اور بے رحمی کو رومانوی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اور اس موضوع کے بیان میں شعریت اور تغزل کو ملحوظ رکھا ہے۔ ان کی غزل میں زمانہ ایک بے رحم ''رقیب'' کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ یہ رقیب، عاشق اور محبوب دونوں کیلئے دشمنِ جاں کا درجہ رکھتا ہے۔

یہ ظالم زمانہ دکھائے گا کیا کیا
تری آنکھ بھی آج تر دیکھتے ہیں

قدم قدم پہ لیا انتقام دنیا نے
تجھی کو جیسے گلے سے لگائے پھرتے ہیں

اور ایک منزل ایسی بھی آتی ہے، جب محبوب خود شریکِ زمانہ ہو جاتا ہے۔

زمانہ کی شکایت کیا، زمانہ کس کی سنتا ہے
مگر تم نے تو آوازِ جنوں پہچان لی ہوتی

قابل نے زمانے کی بے مہری کا تذکرہ مختلف پیراؤں میں کیا ہے۔ انھوں نے اس مضمون کو

خالص ذاتی اور انفرادی سطح پر غمِ عشق سے جدا کر کے بھی دیکھا ہے۔ان کے دل میں زمانے کے خلاف نبرد آزما ہونے کا عزم ہے لیکن انھیں اپنی بے سروسامانی کا احساس بھی ہے۔

جب کسی موڑ پہ آتا ہے زمانہ قابلؔ
زندگی مرحلۂ دار و رسن ہوتی ہے

حوادث ہمسفر اپنے، تلاطم ہم عناں اپنا
زمانہ لوٹ سکتا ہے تو لوٹے کارواں اپنا

قابلؔ کے ہاں دنیا کے جوروستم کا ذکر روایتی طور پر نہیں ہوا۔انھوں نے ایک رائج مضمون کے طور پر اس خیال کو نہیں باندھا۔قابل کی شاعری دراصل ان کی اپنی زندگی کی عکاس ہے۔وہ خود کہتے ہیں:

جہانِ دارورسن ہو کہ بزمِ شعر و شراب
ہمارے سامنے اپنی ہی زندگی آئی

قابلؔ نے اپنی مختصر سی زندگی غم و آلام کے سائے میں بسر کی۔ان کی حیاتِ چندروزہ دکھوں اور تکالیف سے عبارت ہے۔وہ بہت نوعمری میں یتیم ہو گئے۔بچپن ہی میں ہجرت کے تجربے سے گزرنا پڑا،غمِ روزگار نے ان کا جینا مشکل کر دیا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر تپ دق کا موذی مرض کہ جو لمحہ بہ لمحہ موت کا احساس شدید تر کیے جا رہا تھا— قابلؔ سخن کے پردے میں اس زندگی کی روداد بیان کرتے ہیں۔ان کی داستانِ حیات غریب و سادہ ہے، لیکن انھوں نے شعری حسن کاری سے کام لیتے ہوئے اس میں رنگینی بھر دی ہے۔وہ تغزل کے پیکر میں غمِ روزگار اور گردشِ ایام کی تصویر پیش کرتے ہیں۔قابلؔ کی زندگی محرومیوں اور حادثوں سے وابستہ رہی۔وہ تمام زندگی دکھوں اور مصیبتوں سے نبرد آزما رہے۔وہ زندگی کے مسائل سے پہلو تہی کرنے کے بجائے ایک حوصلہ مند انسان کی طرح مدافعت کرتے ہیں۔سحر انصاری کے الفاظ میں ”قابلؔ کی غزل میں مسائلِ حیات سے گریز کے بجائے ایک باشعور اور حساس فرد کا مثبت ردِ عمل ملتا ہے۔ان کے یہاں

زمانے سے گرم تیز ہونے کا حوصلہ بھی ہے اور تعمیر کی حسرت بھی۔"[16] قابلؔ نے زندگی کے سفر میں غم واندوہ کو زادِراہ اور چراغِ رہگزر بنالیا۔ انھوں نے جگر کے داغوں کو زندگی کی راہ میں شمعِ فروزاں سمجھ کر اپنایا، جس کے سبب ان کی امنگیں اور آرزوئیں زندہ وتابندہ تر ہوتی چلی گئیں۔ قابلؔ نے زندگی کی تلخیوں سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ وہ غم وآلام کو "جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں" کہہ کر سینے سے لگا لیتے ہیں اور گردشِ ایام کا "چشم ماروشن، دلِ ماشاد" کہتے ہوئے استقبال کرتے ہیں۔

اے گردشِ دوراں آ تجھ کو بھی اماں بخشیں
ہم نے غمِ جاناں کو سینے سے لگایا ہے

قابلؔ ایک ہارے ہوئے مشتعل انسان کی طرح غمِ دوراں کے خلاف احتجاج نہیں کرتے بلکہ غمِ جہاں کو غمِ جاناں سے وابستہ کرتے ہوئے شعر میں دلکشی اور حسن پیدا کرتے ہیں۔ دورِ حاضر کے شاعر احمد فراز نے کہا تھا:

غمِ دنیا بھی غمِ یار میں شامل کر لو!
نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

قابلؔ نے بہت پہلے غمِ دنیا میں غمِ یار شامل کرتے ہوئے شرابِ شعر کی تاثیر میں اضافہ کیا۔ یہ سلیقہ قابلؔ نے اپنے ایک اہم معاصر فیض احمد فیض سے سیکھا تھا۔ فیض کا ایک شعر دیکھیے۔

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

قابل نے اس خیال کو ایک نئے انداز میں بیان کیا ہے:

غمِ جہاں کے تقاضے شدید تھے ورنہ
جنونِ کوچۂ دلدار ہم بھی رکھتے ہیں

قدرت نے قابلؔ کو انجذاب اور اکتساب کی غیر معمولی صلاحیت سے نوازا تھا۔ فیض کے

دلکش اسلوب اور منفرد لہجے نے انھیں اپنی طرف متوجہ کیا چنانچہ انھوں نے کسی قدر اس اہم سخن گو سے بھی فیض حاصل کیا۔ فیض نے کہا تھا:

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

اب ذرا قابل کا شعر ملاحظہ ہو جس میں شبِ فراق کے بعد طلوعِ صبح کا منظر پیش کیا گیا ہے:

اے آفتابِ صبحِ بہاراں سلام کر
دیوانے آ رہے ہیں شبِ غم گزار کر

مصرعِ ثانی واضح طور پر فیض کا پرتو لیے ہوئے ہے تاہم یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ قابل کے مجموعی کلام میں اس قسم کی واضح جھلکیاں خال خال ہی ملتی ہیں۔ قابل کی طبیعت میں بلا کی جدت اور انفرادیت تھی۔ انھوں نے نمایاں طور پر کسی شاعر کے اثرات قبول نہیں کیے۔ وہ اپنا ذاتی اسلوب، آہنگ اور لہجہ تشکیل دینے میں مصروف رہتے تھے۔

قابل کے ہاں غمِ دوراں کے حوالہ سے بات ہو رہی تھی۔ اس ضمن میں ایک نقاد ارشد رضا کی رائے ملاحظہ ہو:

''قابل کی شاعری میں زندگی کی تلخیاں اور نفسیات کی باریکیاں ایسی سموئی ہوئی ہیں، جس طرح ایک کامل مصور مختلف رنگوں کے امتزاج اور خطوط کی کشید سے ایک ایسی تصویر بناتا ہے کہ دیکھنے والوں پر سحر کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔''[۱۷]

اور اب چند سحر انگیز تصاویر دیکھیے:

ہم بے کسوں کی بزم میں آئے گا اور کون
آ بیٹھتی ہے گردشِ دوراں کبھی کبھی

رخِ حیات کی افسردگی نہیں جاتی
نہ جانے کونسا غم تشنۂ بیاں ہے ابھی

غمِ حیات نے چھلکا دیئے ہیں پیمانے
سرورِ چشمِ غزالاں کی بات کون کرے

قابلؔ کے کلام میں امید کا خوش کن احساس دکھائی دیتا ہے۔ وہ پختہ عزم اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے غم واندوہ سے مقابلہ کرتے ہیں اور اس دوران میں کسی بھی منزل پر مایوسی کا شکار نہیں ہوئے۔ وہ مصیبتوں کو مسکراتے ہوئے برداشت کرنے کا عجیب وغریب حوصلہ رکھتے تھے۔ نربھے رام جوہر اس پہلو کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اس کے کلام میں یاسیت کے اندھیرے نہیں بلکہ امید کے اجالے نظر آتے ہیں۔''[۱۸]

ہر صبح جاگتا ہوں نئی آرزو کے ساتھ
غم مجھ کو زندگی سے گریزاں نہ کر سکے

بے کسی سے بڑی امیدیں ہیں
تم کوئی آسرا نہ دے جانا

کہیں امید کے سوتے بھی خشک ہوتے ہیں
ہجومِ یاس میں آنسو بہا رہا ہے کوئی

قابلؔ نے حسنِ تعلیل کا استعمال کرتے ہوئے امید وبیم کے مابین ایک رشتہ قائم کیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے مسلک میں مایوسی کفر ہے، اس لیے وہ ناامیدی کے اندھیروں میں امید کی شمع فروزاں رکھتے تھے۔

قابلؔ زندگی کو ایک ٹھوس اور اٹل حقیقت تصور کرتے ہوئے غم وآلام کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتے۔ وہ موت کو علاجِ زیست نہیں سمجھتے۔ قابلؔ زندگی کو ایک مقدس فرض سمجھ کر بسر کرنے کے قائل ہیں۔

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو مری ضرورت ہے

''......قابل کے یہاں یہ اعتماد آ درش ایک اور رویے کی صورت میں ابھرتا ہے اور اسی اعتماد کے تانے بانے سے اس کی شاعری نے اپنا پیرہن بنایا ہے۔''[۱۹]

قابلِ غم آشنا کو کیا ہوا
زندگی پر مہرباں ہے آج کل

زندگی کتنی مختلف تھی مگر
ہم ترے ساتھ مسکراتے رہے

لیکن دل بہرحال دل ہوتا ہے، یہ سنگ وخشت کا نام نہیں۔قابل ایک حساس دل کے مالک تھے چنانچہ جب ان کا دل درد سے بھر آتا ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں: مرنے میں ہے نجات مگر جی رہے ہیں ہم۔

جیسے ہم جان ہی نہیں رکھتے
موت کا اجتناب تو دیکھو

تمھیں خبر بھی ہے یارو کہ دشتِ غربت میں
ہم آپ اپنا جنازہ اٹھائے پھرتے ہیں

قابل کے ہاں اس نوعیت کے شعر ضرور موجود ہیں جن سے قنوطیت اور مایوسی کی لہریں اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔اس قسم کے اشعار ملحوظ رکھتے ہوئے ایک نقاد غیاث الدین قریشی نے ان کے بارے میں یہ رائے مرتب کی:

''قابل کے کلام میں یاس اور امید کی متضاد کیفیات بہت نکھرے ہوئے رنگ میں نظر آتی ہے۔''[۲۰]

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قابل زمانے کی تلخیوں اور حوادثِ روزگار کا اظہار عموماً رجائی انداز میں کرتے ہیں لیکن ناسپاسی اور ملال کے افسردہ رنگ بھی اپنی جھلک دکھا جاتے ہیں۔

خمریات ـــــ اردو غزل کا قدیم اور روایتی مضمون ہے۔اس مضمون کو مختلف شاعروں نے

اپنے اپنے انداز میں موضوعِ سخن بنایا ہے۔ میر تقی میر کو محبوب کی نیم باز آنکھوں میں شراب کی مستی دکھائی دی، فاقہ مست غالب قرض کی مئے پیتے رہے، ریاض خیرآبادی بن پئے ہی جھوما کیے، جگر مرادآبادی کو شراب نے مارا اور عبدالحمید عدمؔ ساری زندگی شراب، شراب پکارتے رہے۔ قابلؔ بھی اس موضوع کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے اس مضمون کو روایتی طور پر بھی برتا اور روایت میں اضافے کی کوشش بھی کی۔ روایتی شعر دیکھیے:

صراحی کا بھرم کھلتا نہ میری تشنگی ہوتی
ذرا تم نے نگاہِ ناز کو تکلیف دی ہوتی

قابلؔ ایک روایتی مضمون میں جدت کی شان پیدا کرنے پر قادر تھے۔ وہ عصری شعور سے کام لیتے ہوئے نظامِ میکدہ کی تطبیق جاگیردارانہ نظام پر کرتے ہیں اور استحصالی قوتوں کی دائمی بالادستی پر اس طرح طنز کرتے ہیں:

آج بھی وہ غرقِ مستی آج بھی ہم تشنہ کام
میکدہ بدلا مگر بدلا نہ پیمانوں کا رخ

اس خیال کو انھوں نے واشگاف اور بیانیہ انداز میں یوں پیش کیا ہے:

مشرق سے نمودار ہوئی سرخ سحر بھی
مزدور کی دنیا میں ابھی تک ہے مگر شام

اس شعر سے قابل کے مشرب اور نظریے کی خبر ملتی ہے۔ یہ بحث آئندہ اوراق میں ہوگی۔ اس وقت ان کی رند مشربی پیشِ نظر ہے۔

قابلؔ اپنے عہد کے دو رند مشرب اہم شعراء جگر مرادآبادی اور عبدالحمید عدم سے متاثر تھے خصوصاً جگر مرادآبادی سے تو نیازمندی کا سلسلہ بھی تھا۔ جگر خود بھی قابلؔ کے قدردانوں میں شامل تھے۔ جگر نے ''قابلؔ کے سو شعر'' کے آغاز میں اپنے رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا:

''قابلؔ کے کلام سے ان کی انفرادیت نمایاں ہے اور یہی خصوصیات شاعر کیلئے اہم اور اہم

تر ہے۔ میں نے جب پہلی بار ان کا کلام ان ہی کی زبانی سنا تو حقیقتاً بہت متاثر ہوا۔ خیالات اور جذبات کے ساتھ ساتھ اسلوبِ بیان بھی شگفتہ و پاکیزہ اور تغزل کا حامل ہے۔"

جگر کا یہ خراجِ تحسین قابل کیلئے ایک اعزاز کا درجہ رکھتا ہے۔ اس دور میں ہر طرف جگر کا طوطی بولتا اور ڈنکا بجتا تھا۔ قابلؔ نے بھی جگر کی شخصیت اور کلام سے واقفیت حاصل کی۔ اس شناسائی نے ان کی اپنی شاعری پر بھی نقوش ثبت کیے تاہم جگر ہی کے لفظوں میں انھوں نے اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھی اور ایسے ایسے دلنشین شعر کہے:

مری توجہ عجب توجہ، مرا تغافل عجب تغافل
شکستِ ساغر کو دیکھتا ہوں شکستِ دل کی خبر نہیں ہے

الٹ جاتے ہیں خم، گردش میں پیمانہ نہیں رہتا
تمہارے بعد میخانہ بھی میخانہ نہیں رہتا

قابلؔ کی شاعری کے تفصیلی مطالعہ سے ایک بات جو خاص طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قابلؔ موضوعات کو حسابی اور میکانکی انداز میں نہیں برتتے۔ متنوع خیالات اور مضامین کڑیوں کی صورت میں ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں اور یوں غزل کی ایک سنہری زنجیر تشکیل پاتی ہے۔ قابل ایک طرف شرابِ ناب میں محبوب کے کیفِ نظر کا جلوہ دیکھتے ہیں تو دوسری جانب گردشِ ایام اور گردشِ ساغر میں ایک معنوی ربط تلاش کرتے ہیں۔ غمِ روزگاراں کا ایک مرغوب مضمون ہے۔ انھوں نے اس غم کو ایک مے نوش کی نگاہ سے بھی دیکھا ہے:

لذتِ گردشِ ایام وہی جانتے ہیں
جو کسی بات پہ اٹھ آئے ہیں میخانے سے

قابلؔ کی شاعری کا ایک خاص وصف جذبہ حرکت و عمل ہے۔ وہ مصائب حیات سے گھبرا کر جمود کا شکار نہیں ہوتے بلکہ ایک نئے عزم کے ساتھ زندگی کی نئی نئی منزلوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ان کے ہاں سفر کا استعارہ خاص طور پر بار بار آیا ہے چنانچہ اس کی مناسبت سے کارواں،

منزل، راہنما، راہرو کا تذکرہ بھی ہے۔ وہ نت نئی منزلوں کی تلاش میں شوق کو زادِ سفر کے طور پر ساتھ رکھتے ہیں۔ اقبال کے ہاں عشق ایک مستقل رویے اور نظریئے کے طور پر آیا ہے۔ اقبال نے جذبۂ عشق کو مربوط فکری نظام اور معنوی تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ قابلؔ نے اقبال کے تصورِ عشق کو ایک غزل گو کی حیثیت سے دیکھا ہے اور اقبال کی آتشِ عشق سے اپنا چراغِ شوق روشن کیا ہے۔ قابلؔ کے تصورِ عشق میں سود و زیاں کا کوئی مفہوم نہیں۔ وہ نفع و ضرر سے بے نیاز ہو کر سفر پر روانہ ہوتے ہیں اور اس سفر میں شوقِ منزل کو اپنے ہمراہ رکھتے ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق زندگی کے سفر میں اگر شوق راہنمائی کرے تو یہ مرحلہ بخوبی طے ہو جاتا ہے۔

شوق ہو راہنما تو کوئی مشکل نہ رہے
شوق مشکل سے مگر راہنما ہوتا ہے

قابلؔ کے ہاں جذبۂ عمل کا اس قدر وفور نظر آتا ہے کہ وہ منزل سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ وہ نامساعد حالات میں زندگی کی تلخیوں سے نبرد آزما ہونے کی جرأت بھی رکھتے تھے اور حوصلہ بھی اور قابلؔ میں یہ جرأت اور حوصلہ جذبۂ شوق کی دین تھا۔ ذرا ان اشعار کے تیور ملاحظہ ہوں:

برہم ہوں بجلیاں کہ ہوائیں خلاف ہوں
کچھ بھی ہو اہتمامِ گلستاں کریں گے ہم

اک والہانہ شان سے بڑھتے چلے گئے
ہم امتیازِ ساحل و طوفاں نہ کر سکے

قابلؔ کی ذات میں مسلسل آگے بڑھنے کی خواہش اس قدر زیادہ ہے اور اپنی کامیابی کا اتنا یقین ہے کہ سفر میں بھی انھیں یہ فکر دامن گیر رہتی ہے۔

ع مگر جب سامنے آ جائے گی منزل تو کیا ہو گا

یہ وہ منزلِ شوق ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا:

ع ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

قابلؔ نے ''شوق'' کو روایتی عشق کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ قابل کا کمال یہی ہے کہ وہ لفظ میں پوشیدہ معنوی پرتوں سے آگہی رکھتے ہیں اور اس کے فنی اور تخلیقی اظہار میں مختلف اور ممکن پیرائے تلاش کرتے ہیں۔

انقلاب بیسویں صدی کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ صدی تضادات، حادثات اور آشوب سے عبارت ہے۔ حالات گذشتہ صدی میں بھی مختلف نہیں تھے، مگر دورِ جدید کے شعراء نے عصری آگہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شعوری اور لاشعوری سطح پر انقلاب کو مستقل رویے کے طور پر موضوعِ سخن بنایا ہے۔ قابلؔ بھی ایک حساس باشعور فرد کی طرح انقلاب کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیکی معاشرتی و سماجی اقدار اور سیاسی صورتحال میں تبدیلی ایک لازمی اور فطری امر ہے۔

کوئی اپنے انداز بدلے نہ بدلے
زمانہ مگر انقلاب آشنا ہے

۱۸۵۷ء میں انگریز حکومت کے خلاف برصغیر کے حریت پسندوں نے جواں ولولوں اور تازہ دم حوصلوں کے ساتھ نعرۂ جنگ بلند کیا۔ انھوں نے ایک ایسے انقلاب کی بنیاد رکھی جس کے اثرات دور دور تک محسوس کیے گئے۔ شمعِ آزادی کے پروانے وقتی طور پر شکست سے دوچار ضرور ہوئے تھے مگر بعد میں یہ ناکامی کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ قابلؔ نے ناکام جنگِ آزادی کا تجزیہ یوں کیا ہے:

رنگِ محفل چاہتا ہے اک مکمل انقلاب
چند شمعوں کے بھڑکنے سے سحر ہوتی نہیں

لیکن انھیں اس بات کا بھی احساس ہے:

جو رگِ حریت سے ٹپکا ہو
وہ لہو رائیگاں نہیں جاتا

قابلؔ رنگِ حنا پر خونِ جگر کو فوقیت دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہر نئے دور کے آغاز کا مضمون خون کی سرخی سے رقم ہوتا ہے۔ قابلؔ نے ایک اور جگہ نہایت کرب سے کہا ہے:

آشیانے تو جل بھی جاتے ہیں
پر غمِ آشیاں نہیں جاتا

اور یہی احساسِ زیاں نئے آشیاں بنانے کی تحریک اور ترغیب دیتا ہے:

برہم ہوں بجلیاں کہ ہوائیں خلاف ہوں
کچھ بھی ہو اہتمامِ گلستاں کریں گے ہم

اور پھر دنیا کی آنکھ نے دیکھا کہ یقینِ محکم اور جہدِ مسلسل سے قوم نے ایک علاحدہ وطن حاصل کرلیا۔ قابل نے سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صورتحال کا تجزیہ کیا ہے۔ احمد ضیا کے بقول "قابلؔ نے جس پختگی اور ہوشمندی سے برصغیر کی گزشتہ دو سو سالہ سیاسی حالات کی تصویر کشی کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔"[۲۱]

قوم نے ایک عظیم قربانی کے بعد ایک الگ خطۂ زمین حاصل کرلیا لیکن بدقسمتی سے ملک کو تا حال مخلص سیاسی راہنما میسر نہیں آئے۔ قابلؔ نے نہایت معنی خیز انداز میں اس جانب اشارہ کیا:

ہزار محکم سہی سفینہ، مجھے بھروسہ مگر نہیں ہے
کوئی بھروسہ کرے بھی کیونکر کہ ناخدا معتبر نہیں ہے

قابلؔ کے خدشات درست ثابت ہوئے اور ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ فیض احمد فیض نے اس قسم کے پیچیدہ سیاسی و ملکی حالات کے پیشِ نظر مایوس ہوکر کہا تھا:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر

چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ قابل اجمیری بھی یاسیت اور ناامیدی کا شکار ہو کر قنوطی لہجے میں کہتے ہیں:

دل بھی ہے چاک چاک، جگر بھی ہے داغ داغ
لائی تھی شہرِ گل میں تمنا بہار کی

مذکورہ شعر میں فیض کے اسلوب اور مضمون کی واضح طور پر جھلک ہے تاہم قابل اگلے ہی لمحے ایک نئی صبح کی نوید بھی سناتے ہیں:

ظلمتِ دیر و حرم سے کوئی مایوس نہ ہو
اک نئی صبح ابھرنے کو ہے میخانے سے

قابل کا لہجہ خطابیہ ہے، جیسے پوری قوم کو امید کا پیغام دے رہے ہوں۔ دراصل ہر نوزائیدہ ملک کو ابتدا میں سیاسی، معاشرتی اور نظریاتی سطح پر بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ سب کچھ فطری بات ہے۔ وفا راشدی اس دور کے تضادات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ہمارا دورِ غلامی ختم ہو چکا ہے لیکن خواجگی و بندگی، سرمایہ داری و مفلسی، اعلیٰ و ادنیٰ، آسمان و زمین کی کشمکش ہنوز جاری ہے۔ آزادی نے سرمایہ داری کے ہاتھوں بہت سے نئے نئے حربے دے دیئے ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اخلاق و انسانیت کی دیواریں بے دردی سے توڑی جا رہی ہیں اور مظلومی، بیکسی و مجبوری کے سائے بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ شاہراہِ حیات پہلے سے زیادہ تیرہ و تاریک اور ہولناک ہے۔ انسانی زندگی عجیب کس مپرسی اور دل سوزی کے عالم میں سانس لے رہی ہے۔ عوام پہلے سے زیادہ بے چارگیوں کا شکار ہیں لیکن مظلوموں، بیکسوں اور مجبوروں کو اپنی محرومی، مجبوری و بے چارگی کا احساس ہو چکا ہے۔''[۲۲] دراصل یہ ترقی پسندانہ طرزِ فکر ہے ترقی پسند تحریک نے شعر و ادب پر گہرے اثرات مرتسم کیے۔ موضوعاتی سطح پر

قابل اجمیری بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے لیکن نظریاتی سطح پر ان کا رویہ مختلف رہا۔ انھوں نے اشتراکیت کے مثبت افکار سے روشنی ضرور حاصل کی لیکن وہ اس سے ذہنی طور پر وابستہ نہ ہو سکے۔ ان کے نزدیک اشتراکی نظام انسانیت کے غموں کا مداوا نہیں کر سکتا۔ اس ضمن میں ان کا رویہ ایک ناقد کا سا ہے۔

مشرق سے نمودار ہوئی سرخ سحر بھی
مزدور کی دنیا میں ابھی تک ہے مگر شام

قابلؔ جدید رجحانات اور نئے میلانات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا غزل اب فسانۂ حسن و عشق نہیں رہی بلکہ اس کے معیارات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ غزل کو عصری صداقتوں کا آئینہ دار بھی ہونا چاہیے۔ یہ احساس ترقی پسند تحریک نے ان کے دل میں پیدا کیا چنانچہ وہ معاشرتی استحصال اور سیاسی جبریت کو بھی موضوعِ سخن بنانے لگے۔ قابلؔ اجمیری نے اس عہد ساز تحریک کے بعض افکار و خیالات رد کرتے ہوئے صحت مند تصورات قبول کیے۔ رعنا ناہید رعنا کے بقول:

''اس کی شاعری صحت مند نظریات اور مثبت اقدار کی آئینہ دار ہے، جس میں خیال کی وسعت اور فکر کی گہرائی ہے۔''[۲۳] ترقی پسند شاعری میں زیادہ تر مخصوص موضوعات کے اظہار میں واشگاف انداز اور بیانیہ رویہ دکھائی دیتا ہے۔ بہت کم سخنور ایسے ہیں جنھوں نے غزل کے ایمائی مزاج کو برقرار رکھا ہے۔ اس ضمن میں فیض احمد فیض کا نام بہت اہم ہے۔ فیض کا شمار رواں صدی کے نمایاں سخنوروں میں ہوتا ہے۔ فیض نے کلاسیکی روایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک علامتی نظام تشکیل دیا اور اس نظام کو سہارا بناتے ہوئے سیاسی و سماجی استحصال کی نقاب کشائی کی۔ فیض نے سیاسی جبریت کی وضاحت کیلئے ''زنداں'' کا استعارہ تخلیق کیا اور اس استعارے کی مدد سے اپنے عہد کے آشوب کو نظم کیا۔ فیض نے بظاہر ایک سپاٹ مضمون میں رومان کی دلکشی بھر دی:

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل نے سمجھا یہ
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی

قابل اجمیری ایک سخن شناس شاعر تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ فیض کا اسلوب ہی اس قسم کے موضوعات بیان کرنے کا متحمل ہو سکتا ہے چنانچہ وہ فیض کے اسلوب اور علامتی نظام کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سماجی طاقتوں کی تخریب کاریوں، سرمایہ داری نظام کی نفع خوریوں اور سیاسی استبداد کی چیرہ دستیوں کو شعر کے پردے میں عریاں کرنے لگے۔ اس حوالہ سے انھوں نے فیض کی تقلید میں ''زنداں'' ہی کو بنیادی استعارہ بنایا:

شاید کسی آنسو سے زنداں بھی چمک اٹھے
گلشن کے چراغوں کو شبنم نے جلایا ہے

جائیں گے تو مل جائیں گے ہمدرد بہت
زنداں ہی تو ہو گا درِ جاناں تو نہ ہو گا

قابل کا ایک شعر ملاحظہ ہو جس میں اشتراکی رنگ و آہنگ نمایاں ہے:

جس نے چراغِ شامِ غریباں بجھا دیا
اس ہاتھ کا مذاق اڑاتی ہے چاندنی

چاندنی کے دوام کا مضمون فیض نے اپنے اسلوب میں ایک نظم ''زنداں کی ایک شام'' میں یوں بیان کیا تھا:

جلوہ گاہِ امید کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

قابل نے عصری شعور کے اظہار میں غزل کا پیرایہ قائم رکھا ہے اور غزل ہی کے رموز و علائم میں اپنے عہد کے کرب کو بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں رعنا ناہید رعنا کی رائے ہے:

''قابل کی شاعری عصری صداقتوں کی آئینہ دار ہوتے ہوئے بھی غزل کا مزاج برقرار رکھتی

ہے۔''[۲۴]

نئی سحر کے اجالے بھی اجنبی نکلے
نگاہِ شوق سے دامن بچائے پھرتے ہیں

صحرا بھی مہک اٹھے، زنداں بھی چمک اٹھے
طوفانِ بہار اب کے رکتے ہوئے آیا ہے

مصرع ثانی فیض کے اس مصرع کا پرتو لیے ہوئے ہے:
ع آتے آتے یونہی پل بھر کو رکی ہوگی بہار

قابلؔ کے ''احتجاجی ادب'' کا لب ولہجہ ایک حد تک فیض کا رنگ لیے ہوئے ہے۔
بحیثیتِ مجموعی قابل اجمیری کی غزل کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر کلاسیکی لب ولہجہ کے شاعر ہیں۔ان کے ہاں روایت کی تقلید کا قرینہ بدرجہ اتم موجود ہے تاہم ان کی کوشش ہوتی ہے کہ غزل میں وسعت پیدا کی جائے اور اس کے موضوعات میں اضافہ کیا جائے۔قابل کی شاعری کا سب سے اہم موضوع حسن وعشق ہے۔وہ افسانۂ حسن وعشق کو نفسیاتی بصیرت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔وہ عشق وعاشقی کو زندگی (اور شاعری) کا حاصل نہیں سمجھتے بلکہ حیات کی تلخ حقیقتوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔خصوصاً غمِ روزگار اور گردشِ دوراں کے حوالے سے انھوں نے قابل ذکر شعر کہے ہیں۔ان کے بعض اشعار تو ضرب المثل کا درجہ پا چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے کرب اور عصری صداقتوں سے صرف نظر نہیں کیا بلکہ انھیں رموز وعلائم کے پردے میں بیان کیا ہے۔وہ اپنے دور کے جدید رجحانات اور میلانات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔اس لیے ان کی شاعری میں جدت اور تازگی کا حسن بھی کارفرما دکھائی دیتا ہے۔قدرت نے قابلؔ کو اخذ واستفادہ کی دولت سے نوازا تھا اور وہ اس صلاحیت سے خاطر خواہ فائدہ بھی اٹھاتے ہیں چنانچہ ان کے کلام میں اکتساب کے دلکش رنگ بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔انھوں نے ''خمریات'' کو بھی موضوعِ سخن بنایا اور بیشمار کیف آور شعر کہے۔یہ وہ نمایاں خیالات اور بنیادی موضوعات ہیں جن کے امتزاج سے قابلؔ کا فکری نظام تشکیل پایا ہے۔قابلؔ کے اندر شاعری کے بے پناہ امکانات

تھے۔ اگر زندگی ان سے وفا کرتی تو یہ امکانات مکمل طور پر اجاگر ہوتے تاہم قابل کے موجود کلام کے حوالے سے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ انھیں جدید اردو غزل کی تاریخ میں آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکے گا:

یہ طرزِ فکر یہ رنگِ سخن کہاں قابل
ترے کلام سے پہلے، ترے کلام کے بعد

فنی جائزہ:

قابل اجمیری کا شاعرانہ اسلوب روایتی انداز کا حامل ہے تاہم اس ضمن میں انھوں نے صرف شستہ اور اعلیٰ روایات کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان کا اسلوب افکار و خیالات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ ان کے شعری آہنگ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہیئت اور مواد میں بے مثل توازن موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار عمدہ تخلیقی سانچوں میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ قابل نے غزل کے رواجی سانچے کو برقرار رکھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی غزل میں ردیف، قافیہ، مطلع، مقطع وغیرہ کا روایتی نظام موجود ہے۔ ان کے کلام میں کہیں غیر مردف غزل نظر نہیں آتی۔ وہ مطلع اور مقطع میں کسی تجربے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ عبادت بریلوی کے بقول:

''وہ غزل کی حدود سے باہر نہیں نکلتے۔ اس کی بندشوں کو نہیں توڑتے۔ اس کے احتیاسات کا خون نہیں کرتے۔''[۲۵] قابل اجمیری کے کلام میں بیشتر غزلیں اشعار کی تعداد کے اعتبار سے اوسط طوالت کی ہیں۔ زیادہ تر غزلیں آٹھ، نو اشعار پر مبنی ہیں۔ وہ ایک غزل میں کم سے کم چھ اشعار اور زیادہ سے زیادہ بارہ اشعار رکھتے ہیں لیکن طوالت کے باعث ان کے کلام کے معیار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ وہ ممکنہ قوافی کے استعمال کیلئے غزل کو طول بھی نہیں دیتے بلکہ ان کے ہاں ''قافیہ پیمائی'' فطری انداز میں ہوتی ہے۔ ہیئت کے حوالے سے قابل کے کلام میں کوئی تنوع یا تجربہ نہیں ملتا۔ وہ نہ تو ایک ہی زمین میں مختلف انداز میں بار بار طبع آزمائی کرتے ہیں اور نہ مسلسل غزل کی طرف ہی توجہ دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں کہیں بھی دوغزلہ کی صورت نہیں ہے۔ غزلِ مسلسل کا انداز بھی کہیں نہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ نظم ان کے مزاج

کا حصہ نہیں تھی۔ اس لیے وہ نظم کی سی یکسانیت اور تسلسل کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ روایتی غزل کی طرح ان کے ہاں ہر شعر الگ اکائی کی صورت میں تخلیق ہوا ہے حتیٰ کہ وہ قطعہ بند اشعار کی روایت کی پاسداری بھی نہیں کرتے اور اس کہ ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ کسی بھی خیال یا مضمون کو شعر کی اکائی میں پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ طویل مضمون کو غزل کا حصہ بناتے ہی نہیں ہیں۔ اس لیے قطعہ بند اشعار کہنے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ شعر کہنے کے ہنر اور سلیقے سے واقف تھے اور ایک خیال کو صرف دو مصرعوں میں بیان کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔

قابلؔ اجمیری کو لفظوں کے انتخاب نے بھی کبھی رسوا نہیں کیا۔ وہ لفظ کے تخلیقی استعمال سے آگاہ تھے اور الفاظ کے برتنے میں انھیں فنکارانہ قدرت حاصل تھی۔ جس جگہ جو لفظ موزوں اور مناسب ہو وہاں وہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ لفظوں کی دروبست کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اور شعر میں لفظ کی نشست اتنی مستحکم اور محکم رکھتے ہیں کہ اس لفظ کو کسی اور لفظ سے تبدیل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آتش کے مطابق اس ہنرمندی کو ''مرصع سازی'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس ہنرمندی کی وجہ سے ان کے اندازِ سخن میں اک خاص طرز کی سبک روی، نرمی اور تازگی ہے۔ چند دلکش اشعار ملاحظہ ہوں جن میں ''مرصع سازی'' عروج پر ہے۔

رکا رکا سا تبسم، جھکی جھکی سی نظر
تمہیں سلیقۂ بیگانگی کہاں ہے ابھی

ہم بے کسوں کی بزم میں آئے گا اور کون
آ بیٹھتی ہے گردشِ دوراں کبھی کبھی

تمہاری گلیوں میں پھر رہا ہوں، خیالِ رسمِ وفا ہے ورنہ
میں اپنے غم خانۂ جنوں میں تمہیں بلانا بھی جانتا ہوں

جنم جنم کے اندھیروں کو دے رہا ہے شکست
وہ اک چراغ کہ اپنے لہو سے روشن ہے

قابلؔ اجمیری کو فارسی زبان و بیان پر بھی عبور حاصل تھا۔انھوں نے اپنی غزل کو کلی طور پر تو مفرس اسلوب سے ہمکنار نہ ہونے دیا تاہم وہ مرصع کاری کیلئے فارسی الفاظ و تراکیب کو بھی استعمال میں لائے ہیں۔ان کے کلام میں فارسی تراکیب اتنے فطری پیرائے میں آتی ہیں کہ ثقالت کا احساس نہیں ہوتا۔ان کی غزلیات میں آنے والی چند ایک تراکیب یہ ہیں:

دردِ خود آ گہی،لطفِ صبحِ نشاط،حدیثِ کاکل ورخسار،شہرِ نگاراں،نگاہِ تغافل شعار،آرزوئے فسوں کار،شعورِ جمال،حریفِ برق وشرر،نشاطِ حسرتِ دیدار وغیرہ۔

قابلؔ اجمیری نے فارسی تراکیب کو اتنے بے ساختہ اور برجستہ انداز میں برتا ہے کہ آورد اور تصنع کا احساس بالکل نہیں ہوتا بلکہ تراکیب ایک فطری بہاؤ کے تحت ان کے کلام میں رواں دواں نظر آتی ہیں۔ذیل میں چند اشعار دیئے جا رہے ہیں:

وہی کم مائیگیٔ فکر و نظر ہے کہ جو تھی
ہم انھیں بھول گئے اپنی خبر ہونے تک

تیری محفل کے چراغوں کو خبر ہے کہ نہیں
سینہ چاکانِ شب تار پہ کیا گزری ہے

آج وہ کاتبِ تقدیر بنے بیٹھے ہیں
جن کے سینے میں گدازِ غمِ فردا بھی نہیں

قابلؔ کے مزاج میں اکتساب کی حیرت انگیز صلاحیت تھی۔انھوں نے کھلی آنکھوں سے شعری روایت کا مطالعہ کیا تھا چنانچہ ان کے کلام میں اساتذۂ فن سے استفادے کی مختلف صورتیں موجود ہیں۔یہ استفادہ موضوعاتی اور فنی دونوں حالتوں میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔قابلؔ کے ہاں چند ایسی غزلیں ملتی ہیں جو شعوری طور پر مختلف اساتذۂ فن کی زمینوں میں کہی گئی ہیں تاہم یہ بات اہم ہے کہ قابلؔ نے ''پرائی'' زمینوں میں سخن گوئی کرتے ہوئے قابلِ قدر شعر کہے ہیں۔

قابل جب کسی اور شاعر کی زمین میں طبع آزمائی کرتے ہیں تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ یہ تقلید برائے تقلید نہ ہو بلکہ غزل گوئی کا حق ادا کیا جائے۔اس ضمن میں فرمان فتحپوری کا ایک اقتباس

ملاحظہ ہو:

''......غزل کی بعض حد درجہ فرسودہ اور ناموافق زمینوں میں بھی وہ ایسے آبدار نشتر نکال لیتے ہیں کہ خدا کی توفیق یاد آجاتی ہے۔ آپ کے ذہن میں یہ شعر تو ہوگا۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

یہ شعر نواب امین الدولہ مہر دہلوی کا ہے۔ اس زمین میں اکثر اساتذہ نے غزلیں کہی ہیں، لیکن اس قافیہ اور ردیف میں اچھے اشعار کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے کوئی استاد کامیاب نہیں ہوا۔ غزل پر قابل کی دسترس کا اندازہ اس سے کیجیے انھوں نے اس زمین میں ایسی غزل کہی ہے جس کا ہر شعر قابلِ توجہ ہے۔ خصوصیت سے انھوں نے دو شعر ایسے کہہ دیئے ہیں کہ ان کے کمال فن کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ آپ بھی سن لیجیے۔

یہی ہے دل کی ہلاکت، یہی ہے عشق کی موت
نگاہِ دوست پہ اظہارِ بیکسی ہو جائے

زمانہ دوست ہے کس کس کو یاد رکھو گے
خدا کرے کہ تمھیں مجھ سے دشمنی ہو جائے

اس قسم کے ایک دو نہیں سینکڑوں انمول اور آبدار موتی، قابل اجمیری مرحوم نے اردو شاعری کو دیئے ہیں اور صرف تیس سال کی عمر میں۔''[۲۶]

قابلؔ کے ہاں ذاتی سطح پر متعدد خوبصورت زمینیں ملتی ہیں۔ قابلؔ نے اردو غزل کے دامن میں اس حوالے سے بھی بے شمار پھول کھلائے ہیں۔ قابل کی تشکیل دی گئی زمینوں میں ایک خاصی طرز کی دلکشی اور انفرادیت پائی جاتی ہے اور ذوقِ سلیم ہی ان کی داد دے سکتا ہے۔

جہاں تک قابل کی مختلف غزلوں کی بحروں کا تعلق ہے تو یہ امر اہم ہے کہ ان کے ہاں اس حوالے سے تنوع نظر آتا ہے۔ وہ اپنے خیالات وتصورات کو بہت سہولت کے ساتھ مختلف ہیئتی

پیراؤں میں بیان کرنے پر قادر تھے۔ ان کی شاعری میں مضمون اور بحر میں ایک خاص قسم کی وحدت نظر آتی ہے۔ ان کی بحریں، ان کے مضامین سے خاصی مناسبت رکھتی ہیں۔ بحریں خواہ طویل ہوں یا مختصر قابلؔ نے ہمیشہ غنائیت کا پہلو پیش نظر رکھا ہے چنانچہ ان کی غزلوں کے اشعار بہت رواں اور مترنم ہوتے ہیں۔ ان میں موسیقیت اور نغمگی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ذیل میں مثالوں کے ذریعے مختلف طوالت کی بحروں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ہر بات شریعت ہے کہ نہیں، ہر سانس عبادت ہے کہ نہیں
کیا جانے ترے دیوانے کو عرفانِ محبت ہے کہ نہیں

در و دیوار کو تسکیں کا عنواں ہم بھی کر لیے
محبت درد سر ہوتی، تو درماں ہم بھی کر لیتے

دیدۂ غم کی تھاہ کہاں
ڈوب گئے ہیں کون و مکاں

چھوٹی بحر میں شعر کہنے اور خصوصاً اچھے شعر کہنے کیلئے خاصی ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ قابلؔ نے چھوٹی بحر میں بھی بہت سے دلکش شعر کہے ہیں۔ چند ایسے شعر دیکھیے جن میں سہل ممتنع کا حسن بھی موجود ہے۔

اس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو
زندگی کتنی خوبصورت ہے

بے کسی سے بڑی امیدیں ہیں
تم کوئی آسرا نہ دے جانا

راستہ ہے کہ کٹتا جاتا ہے
فاصلہ ہے کہ کم نہیں ہوتا

قابلؔ طویل بحروں کو بھی مہارت کے ساتھ برتتے ہیں۔ وہ طویل بحر کے تقاضوں سے آگاہ تھے چنانچہ ایسے شعروں میں اندرونی قوافی اور تکرارِ لفظی کا خاص اہتمام رکھتے ہیں۔ اس طرح شعر میں ترنم، موسیقیت اور جھنکار کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ذرا ان اشعار کا انداز ملاحظہ ہو:

خود اہلِ کشتی کی سازشیں ہیں کہ ناخدا کی نوازشیں ہیں
وہیں تلاطم کو ہوش آیا جہاں کناروں نے ساتھ چھوڑا

نہ خم سلامت نہ جام باقی، جھکی جھکی ہے نگاہِ ساقی
نیازمندوں نے آنکھ بدلی، وفا شعاروں نے ساتھ چھوڑا

مری محبت کے دونوں عالم، تمام روشن، تمام محکم
میں یاد کرنا بھی جانتا ہوں ہیں، یاد آنا بھی جانتا ہوں

تمثال کاری شاعری کا ایک اہم عنصر ہے۔ تمثال کاری یا امیجری لفظوں سے تیار کی ہوئی تصویر کا نام ہے۔ اردو غزل میں غالب ایک ایسی توانا شخصیت ہیں، جن کے ہاں تمثال نگاری کا جہاں آباد نظر آتا ہے۔ غالبؔ کے علاوہ اقبال کے کلام میں بھی تمثالِ شعری کے بلند پایہ نمونے ملتے ہیں۔ ولی، میر، سودا، درد، آتش اور مومن کی شاعری میں بھی محاکات نگاری کے خوبصورت انداز نظر آتے ہیں۔ قابلؔ نے جب شاعری کا آغاز کیا تو ان کے سامنے تمثال نگاری کے حوالے سے ایک مضبوط روایت موجود تھی۔ قابلؔ نے شاعری کی اس خوبی کو اپنے طور پر برتنے کی کامیاب کوشش کی۔

تمثال کاری دراصل لفظوں سے پیکر تراشی کا نام ہے۔ قابلؔ کے مختصر کلام میں پیکر تراشی کا حسن موجود ہے۔ قابلؔ کے ہاں ہمیں ساکن اور متحرک دونوں طرح کے امیجز ملتے ہیں۔ ان امیجز کی نوعیت اکثر بصری ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

مری توجہ، عجب توجہ، مرا تغافل، عجب تغافل!
شکستِ ساغر کو دیکھتا ہوں شکستِ دل کی خبر نہیں ہے

مڑ مڑ کے دیکھتے ہیں، شبِ غم کے راہرو
آنکھوں میں روشنی ہے ابھی انتظار کی!

دیوانے چل پڑے ہیں ترے شہر کی طرف
حیرانیوں کو آئینہ ساماں کیے ہوئے

نگاہِ ناز کے احساں اٹھائے پھرتے ہیں
ترے دیار میں ہم سر جھکائے پھرتے ہیں

ایک تمثالِ لامسہ دیکھیے:

اجنبی اجنبی ہے سارا وجود
مجھ کو اپنا رہی ہے تیری یاد

سمعی تمثال کا نمونہ ملاحظہ ہو:

یوں دھڑکنے لگا ہے دل جیسے
پہلی بار آ رہی ہے تیری یاد

اور اب آخر میں ہم قابلؔ اجمیری کی شاعری کو علم بیان و بدیع کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔
علم بیان سے کیا مراد ہے؟ اس کا جواب نجم الغنی نے یوں دیا ہے:
''علمِ بیان ایسے قاعدوں کا نام ہے کہ اگر کوئی ان کو جانے اور یاد رکھے تو ایک معنی کو کئی طریق سے ادا کر سکتا ہے، جن میں بعض طریق کی دلالت معنی پر بعض طریق سے زیادہ واضح ہوتی ہے۔''[۲۷]

علم بیان کے اجزائے ترکیبی درج ذیل ہیں۔
۱۔ تشبیہ ۲۔ استعارہ ۳۔ مجازِ مرسل ۴۔ کنایہ
یہ ارکانِ اربعہ کلام میں حسن، تاثیر اور ایمائیت پیدا کرتے ہیں۔ قابلؔ اجمیری کی شاعری

میں بھی یہ اجزاء پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں اس حوالے سے قابلؔ کی شاعری کا مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

تشبیہ:

"تشبیہ کے معنی کسی خاص لحاظ سے ایک شے کو دوسری شے جیسا ظاہر کرنا کے ہیں۔" قابلؔ کے کلام میں بعض تشبیہات بہت نادر ہیں، مثلاً:

تری آنکھوں میں شامِ میکدہ لیتی ہے انگڑائی
ترے ہونٹوں پہ صبحِ شادمانی رقص کرتی ہے

کٹ گئے ہجر کے پہاڑ سے دن
وقت کو تیرا انتظار نہ تھا

جسے چراغِ شبِ غم میں ہم نے دیکھا تھا
تری نظر میں وہی روشنی نظر آئی

دل کی وادی میں چاند کی طرح
پھیلتی جا رہی ہے تیری یاد

یہ دل کے زخم نہیں، یہ جگر کے داغ نہیں
رہِ حیات میں شمعیں جلا رہا ہے کوئی

استعارہ:

"استعارہ کے لفظی معنی ہیں، مانگا ہوا۔ اصطلاحِ فنِ شعر میں استعارہ اس مشبہ کو کہتے ہیں، جسے کسی معنوی وجہ سے بعینہٖ مشبہ ٹھہرالیا گیا ہو۔" قابلؔ نے بھی اس دلکش شاعرانہ حربے سے کام لیا ہے۔ چند دلنشین استعاراتی اشعار ملاحظہ ہوں۔

آنکھوں سے ٹوٹتے رہے تارے تمام رات
لیکن کسی کو زینتِ داماں نہ کر سکے

قابل نے استعاراتی انداز میں سیاسی جبریت اور عصری صورتحال پر اس انداز میں تبصرہ کیا ہے۔

خود اہلِ کشتی کی سازشیں ہیں کہ ناخدا کی نوازشیں ہیں
وہیں تلاطم کو ہوش آیا جہاں کناروں سے ساتھ چھوڑا

ہمیں تو رونقِ زنداں بنا دیا تم نے
چمن میں صبحِ بہاراں کی بات کون کرے

مجازِ مرسل:

نجم الغنی کے مطابق ''مخفی نہ رہے کہ جو لفظ سوائے معانی موضوع لہ کے اور معانی میں مستعمل ہو اور وہاں کوئی ایسا قرینہ پایا جائے جو اصل معنی مراد لینے سے مخاطب کو روک دے اور دونوں معانی میں کوئی علاقہ سوائے علاقہ تشبیہ کے ہو، اس کو مجاز مرسل کہتے ہیں۔''[۲۸]

قابل کے ہاں مجازِ مرسل کی صورتیں دیکھیے۔

آؤ اپنی زمیں کو چمکائیں
چاند تاروں کا اعتبار نہیں

تیرے در کا طواف کر کے بھی
فکرِ شام و سحر میں رہتے ہیں

تری اک سادہ نظر کا ہے کرشمہ ساقی
ان گنت رنگ جھلکنے لگے پیمانے سے

جس نے چراغِ شامِ غریباں بجھا دیا
اس ہاتھ کا مذاق اڑاتی ہے چاندنی

کنایہ:

سجاد مرزا بیگ کے بقول ''کنایہ لغت میں پوشیدہ بات کرنے کو کہتے ہیں اور اصطلاحِ علم بیان میں ایسے کلمے کو کہتے ہیں جس کے لازمی معنی مراد ہوں اور اگر حقیقی معنی مراد لیے جائیں تو بھی جائز ہو۔'' [۲۹]

قابل نے بھی بعض شعروں میں کنایے کا استعمال کیا ہے جو شعر کی ایمائیت میں اضافے کا سبب بنتا ہے:

صراحی کا بھرم کھلتا، نہ میری تشنگی ہوتی
ذرا تم نے نگاہِ ناز کو تکلیف دی ہوتی

درِ جاناں نہ سہی، سایۂ خنجر ہی سہی
سجدۂ شوق بہرحال ادا ہوتا ہے

لوگ لے آتے ہیں کعبہ سے ہزاروں تحفے
ہم سے اک بت بھی نہ لایا گیا بت خانے سے

اور اب علمِ بدیع کی روشنی میں قابل کے کلام کا مطالعہ! علمِ بدیع کیا ہے؟ سجاد مرزا کے مطابق ''اس علم کو جس سے تحسین و تزئینِ کلام کے طریقے معلوم ہوتے ہیں، علمِ بدیع کہتے ہیں۔'' [۳۰] علمِ بدیع کا مقصد و منصب یہی ہے کہ کلام میں عناصرِ جمال کی نشاندہی کی جائے اور یہ کام مختلف صنعتوں کے استعمال سے ہوتا ہے۔

قابل کے کلام میں بھی صنائع کے مختلف انداز نظر آتے ہیں۔ وہ شاعرانہ صنعتوں سے سخن کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں تاہم یہ بات اہم ہے کہ وہ صنعت گری سے زیادہ کام نہیں لیتے۔ وہ لفظی آرائش سے زیادہ معنوی ابلاغ پر توجہ دیتے ہیں چنانچہ ان کے ہاں مختلف صنعتوں کا استعمال

کم کم ہی ہوا ہے۔ وہ لمحۂ تخلیق میں یہ امر پیش نظر رکھتے ہیں کہ لفظ کی معنویت صنعت پر قربان نہ ہو۔ تاہم وہ کلام کے ظاہری تزئین اور آرائش کی اہمیت سے بھی غافل نہیں۔ ان کے کلام میں جہاں کہیں بھی صنعت گری ہے بالکل فطری اور برجستہ انداز میں ہوئی ہے۔ قابلؔ کی غزل سیدھے سبھاؤ کی غزل ہے، اس میں لفظی و معنوی سطح پر کوئی خاص پیچ اور بل نہیں۔ یہ دل سے نکلی ہوئی شاعری ہے اور براہِ راست دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

قابلؔ کے کلام میں چند صنعتیں بطورِ خاص استعمال ہوئی ہیں۔ ذیل میں ان کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

صنعتِ تکرار:

ایسی صنعت جس میں لفظوں کی تکرار سے زور، تاثیر یا حسن پیدا کیا جائے، مثلاً:

یہ چاک چاک گریباں، یہ داغ داغ جگر
متاعِ حسرتِ دیدار ہم بھی رکھتے ہیں

رکا رکا سا تبسم، جھکی جھکی سی نظر
تمھیں سلیقۂ بیگانگی کہاں ہے ابھی

قدم قدم پہ ترا ہجر بے نقاب ہوا
نفس نفس سے ترے قرب کی خبر آئی

صنعتِ تضاد:

کلام میں دو ایسے لفظ جمع کرنا جو معنوی لحاظ سے ایک دوسرے کے متضاد ہوں، صنعت تضاد کہلاتا ہے۔ قابل کی شاعری میں یہ صنعت بکثرت موجود ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہمارے پاس کہاں آنسوؤں کی سوغاتیں
کسی کو اپنا بنا کے بڑی ہنسی آئی

چھلکتا ہی نہیں پیانہ کوئی
بہار اب کے خزاں ہو جائے گی کیا

جینے کا حوصلہ ہے نہ مرنے کا اختیار
بیٹھا ہوں اک نگاہ سے پیماں کیے ہوئے

صنعتِ تلمیح:

کلام میں کس مشہور واقعے، شخص، چیز یا قرآنی آیت وغیرہ کی طرف اشارہ کو صنعتِ تلمیح کہتے ہیں۔ قابل کے ہاں بھی چند تلمیحات ملتی ہیں مثلاً:

کم سے کم جرأتِ دیدار تو آ ہی جاتی ہے
کاش موسیٰ تری تصویر کو دیکھا کرتے

ہم نے اس کے لب و رخسار کو چھو کر دیکھا
حوصلے آگ کو گلزار بنا دیتے ہیں

صنعتِ لف ونشر:

پہلے مصرعے میں مختلف چیزوں کا بیان اور دوسرے میں اس کے منسوبات اور متعلقات کا تذکرہ صنعتِ لف ونشر کہلاتا ہے۔ قابل کی ایک غزل کے بیشتر اشعار میں اس صنعت کا استعمال ہوا ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

نفس نفس تھا قیامت، نفس نفس ہے سکوں
غمِ تمام سے پہلے، غمِ تمام کے بعد

فضا تمام نشیمن، فضا تمام قفس
خیالِ دام سے پہلے، خیالِ دام کے بعد

صنعت مراعاۃ النظیر :

کلام میں اگر ایسی چیزیں مذکور ہوں جو باہم کسی قسم کی مناسبت رکھتی ہوں، لیکن یہ مناسبت متضاد نہ ہو، تو یہ اجتماع صنعتِ مراعاۃ النظیر کہلائے گا۔ قابلؔ اس صنعت کو مختلف انداز سے بروئے کار لائے ہیں مثلاً:

کیسی رندوں کی طبیعت، کیسا پیمانوں کا رخ
گردشِ دوراں بدل دیتی ہے میخانوں کا رخ

کیوں بجھ گئے چراغ، ستاروں کو کیا ہوا
رات اتنی مختصر تو نہ تھی انتظار کی

صنعتِ حسن تعلیل:

ایک چیز کو کسی چیز کی صفت کیلئے علت ٹھہرانا اور دراصل وہ علت نہ ہو، صنعتِ حسن تعلیل کہلاتا ہے، مثلاً:

کہیں امید کے سوتے بھی خشک ہوتے ہیں
ہجومِ یاس میں آنسو بہا رہا ہے کوئی

صنعتِ سیاقۃ الاعداد:

یعنی کلام میں مختلف اعداد کا ذکر مثلاً:

لوگ لے آتے ہیں کعبہ سے ہزاروں تحفے
ہم سے اک بت بھی نہ لایا گیا بت خانے سے

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ قابلؔ اجمیری مختلف صنائع و بدائع کا استعمال بہت دلکش فطری پیرائے

میں کرتے ہیں۔اس کیلئے انھیں سوچ بچار نہیں کرنا پڑتی بلکہ صنائع و بدائع بے ساختہ اور برجستہ انداز میں شعر میں راہ پاتے ہیں۔

قابلؔ کی غزل کا فنی تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ فنی سطح پر ایک پختہ کار شاعر تھے۔وہ نہایت ہنرمندی سے الفاظ کو معنوی سطح پر برتتے ہیں۔ان کے کلام میں نادر تشبیہات اور استعارات کا استعمال بہت خوب ہوا ہے۔وہ مختلف صنائع و بدائع کو نہایت سہولت اور بے ساختہ پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔قابلؔ کے ہاں زیادہ تر بحریں مترنم اور رواں ہیں۔ان کی بحروں میں موسیقیت بدرجہ اتم موجود ہے۔وہ کہیں کہیں اساتذہ کی مختلف زمینوں میں طبع آزمائی کرتی ہیں تاہم ان کی ذاتی زمینیں بھی اہمیت کی حامل ہیں۔قابل کی غزل میں سادگی اور روانی ہے اور یہ پرکاری کا بھی عمدہ نمونہ ہے۔یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ قابلؔ اجمیری فنی سطح پر بھی ایک ہنرمند اور پختہ کار سخن گو تھے۔

حوالے:

۱۔ فرمان فتح پوری ''غزل میں تجدد کی ایک مثال'' طالب علم ڈائجسٹ (قابل نمبر۲) (حیدرآباد: طالب علم ڈائجسٹ مطبوعات، فروری ۱۹۷۰ء) ص ۲۸

۲۔ نربھے رام جوہر ''قابل اور غزل کی روایت'' طالب علم ڈائجسٹ، ص ۸۳

۳۔ نربھے رام جوہر، ''قابل اور غزل کی روایت'' طالب علم ڈائجسٹ، ص ۸۴

۴۔ کریم الدین احمد ''قابل کی شعری دنیا'' طالب علم ڈائجسٹ، ص ۳۷

۵۔ فرمان فتح پوری، طالب علم ڈائجسٹ، ص ۲۳

۶۔ فرمان فتح پوری، طالب علم ڈائجسٹ، ص ۲۳

۷۔ ساجد امجد۔ڈاکٹر ماہنامہ سرگزشت (کراچی، اکتوبر ۱۹۹۲ء) ص ۴۷

۸۔ محمود ہاشمی، ''قابل ایک علامتی غزل گو'' ماہنامہ ساقی (کراچی، ۱۹۶۹ء) ص ۴۷،۳۷

۹۔ بینش سلیمی ''قابل اجمیری'' نئی قدریں (اردو شاعری نمبر) ۱۹۶۷ء، ص ۵۵۳

۱۰۔ فرمان فتح پوری، طالب علم ڈائجسٹ، ص ۲۶

۱۱۔ سحر انصاری ''شاعر اعتماد قابل اجمیری'' ہفت روزہ فکر و عمل (حیدرآباد، ۳۰ ستمبر

۱۹۷۷ء) ص ٦

۱۲۔ غیاث الدین قریشی ''قابل کے رنگ سخن کا ایک پہلو'' طالب علم ڈائجسٹ، ص ۵۷

۱۳۔ سحر انصاری ہفت روزہ فکر و عمل، ص ۵

۱۴۔ بینش سلیمی، ''قابل اجمیری'' نئی قدریں (اردو شاعری نمبر ۱۹٦۷ء) ص ۵۵۴

۱۵۔ حضور احمد سلیم ''چراغ یقیں'' ہفت روزہ فکر و عمل (حیدرآباد: ۳۰ ستمبر ۱۹۷۷ء) ص ۴

۱٦۔ سحر انصاری ''شاعر اعتماد، قابل اجمیری'' طالب علم ڈائجسٹ، ص ۴۷

۱۷۔ ارشد رضا ''قابل شعلہ ہے شبنم ہے'' طالب علم ڈائجسٹ، ص ۵۳

۱۸۔ نربھے رام جوہر، طالب علم ڈائجسٹ، ص ۸۵

۱۹۔ سحر انصاری ہفت روزہ فکر و عمل، ص ۵

۲۰۔ غیاث الدین قریشی، طالب علم ڈائجسٹ، ص ۵۸

۲۱۔ احمد ضیا ''انقلاب کا مطرب'' طالب علم ڈائجسٹ، ص ۹۱

۲۲۔ وفا راشدی، نخلستان، (جے پور: راجستھان اردو اکادمی) مارچ ۱۹۸۷، ص ٦۴

۲۳۔ رعنا ناہید رعنا ''قابل اجمیری اپنے اشعار کے آئینے میں'' ماہنامہ اظہار (کراچی: ستمبر ۱۹۸۳ء) ص ٦۵

۲۴۔ رعنا ناہید رعنا، ماہنامہ اظہار، ص ۲۳

۲۵۔ عبادت بریلوی ''جوہر قابل'' طالب علم ڈائجسٹ، ص ۲۲

۲٦۔ فرمان فتح پوری، ''غزل میں تجدد کی ایک مثال'' طالب علم ڈائجسٹ، ص ۲۸

۲۷۔ نجم الغنی، بحر الفصاحت (لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء) ص ۱۳۷

۲۸۔ نجم الغنی، بحر الفصاحت، ص ۸۰۵

۲۹۔ سجاد مرزا بیگ، تسہیل البلاغت (دہلی: دفتر کتابت صفوۃ اللہ بیگ صوفی پبلشرز) ص ۱٦۱

۳۰۔ سجاد مرزا بیگ، تسہیل البلاغت، ص ۱٦۷

○

۳۔ قابل اجمیری کی نظم

قابلؔ اجمیری کی شاعری کا اصل اور بنیادی حوالہ غزل ہے۔ اِن کی زیادہ توجہ غزل ہی کی طرف رہی ہے اور سچی بات یہ ہے کہ ان کا توسنِ تخیل غزل ہی کے میدان میں برق رفتاری سے دوڑتا ہے۔ جب غزل کا یہ شہسوار دیگر اصناف کے میدانوں کا رخ کرتا ہے تو اس کی تندی اور تیزی میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ کریم الدین احمد نے قابلؔ کی شاعری کے اس پہلو کو ایک سخت گیر نقاد کی نظر سے دیکھا ہے:

''انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں، لیکن افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ غزل کیلئے بنے تھے۔ ان کی نظمیں بڑی حد تک ناکام ہیں۔ ان میں نہ مرکزی خیال ہے اور نہ خیال کی وحدت۔ فکر بھی اگر ہے تو بہت سطحی۔ جوش اور گھن گھرج بھی ان میں نہیں جو کم از کم نظموں کو ظاہری طور پر سنوارتا ہے۔ نظم خیال کی تعمیر کے بغیر ناکام رہتی ہے۔ اپنی غم پسندی کی وجہ سے جو بھی خیال آتا ہے وہ اس کی تعمیر نہیں کر پاتے''[۱]

___ تاہم کریم الدین احمد آگے چل کر یہ بات تسلیم کی ہے: ''ان نظموں میں کہیں کہیں اچھے اشعار ضرور ہیں اور ہمارے لیے یہی کافی ہیں۔''[۲]

یہ درست ہے کہ قابلؔ اپنی نظم میں وہ معیار قائم نہیں رکھ سکے جو ان کی غزل سے منسوب ہے تاہم ان کی نظمیہ شاعری کو مکمل طور پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ غزل کے علاوہ قابل نے جن اصناف میں طبع آزمائی کی ہے، ان میں نعت، قطعہ، رباعی، گیت اور نظم وغیرہ شامل ہیں۔ ''کلیاتِ قابل'' میں ان اصناف کے بعض عمدہ نمونے ملتے ہیں جن سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا تاہم یہ کم تعداد میں ہیں اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قابل کی توجہ ''نظم نگاری'' کی طرف کم رہی۔ ''کلیاتِ قابل'' میں صرف ایک تہائی کلام ایسا ہے جسے ''نظم'' کی ذیل میں رکھا جاسکتا ہے۔ راقم کو تحقیق کے دوران

قابلؔ اجمیری کی چند موضوعاتی نظمیں اور صحافتی نوعیت کے قطعات حاصل ہوئے ہیں۔ یوں ان کی ''نظم'' کا دائرہ قدرے وسیع ہو جاتا ہے۔

قابلؔ کی شاعری کا ایک اہم موضوع مذہب اور اخلاقیات ہے۔ ذہنی اعتبار سے وہ ایک مذہبی انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں دینی اور اخلاقی نوعیت کے مضامین بکثرت ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اشتراکی رنگ بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اسلامی انقلاب کے داعی تھے۔ وہ معاشرے میں سماجی وسیاسی سطح پر تبدیلی کے خواہاں تھے مگر ان کے پیشِ نظر ایک ایسا انقلاب تھا، جو سراسر اسلام کے رنگ میں رنگا ہو، ان کی نظم ''انقلاب'' کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

اہلِ وحشت مائل عیش و نشاط
ماہرینِ علم و دیں خوار و خراب
جانور کو جانور سے ارتباط
آدمی کو آدمی سے اجتناب

انقلاب اللہ اکبر انقلاب

قابلؔ کی سماعت ''بزمِ دہر'' میں ''اذانِ بلالی'' کی منتظر تھی۔ وہ ایک ایسے انقلاب کے انتظار میں تھے جو تیرگی کے خاتمہ پر منتج ہو۔

ع جانے وہ انقلاب، وہ طوفان کب آئے گا

قابل ایک سچے عاشق رسول تھے۔ حضور اکرمؐ کی ذات سے عقیدت کا اظہار ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ یہ اظہار باقاعدہ صورت میں دو مقامات پر ہوا ہے اور ان کی صرف دو نعتیں سامنے آئی ہیں تاہم ان کی مذہبی شاعری میں نبی کریمؐ سے ربطِ خاطر کے مضامین بکثرت ملتے ہیں۔ قابلؔ کی نعت میں مختلف جذباتی وفکری پیرائے بیان ہوئے ہیں۔ کہیں وہ جمالِ محمدؐ کا مضمون باندھتے ہیں اور کہیں حضور کی شان کا تذکرہ کرتے ہیں۔

کہاں کے اندھیرے، کہاں کے اجالے، تجھ دیکھ لیتے ہیں احساس والے
ترا نورِ عارض تجلی تجلی، ترا عکسِ گیسو شبستان شبستان

اللہ رے کس اوج پہ ہے شانِ محمدؐ
خود شاہدِ مطلق ہے ثنا خوانِ محمدؐ
کیا خوف ترا گرمیٔ خورشیدِ قیامت
ہے موج ہوا زلفِ پریشانِ محمدؐ

قابلؔ نبی اکرمؐ سے شفاعت کے طلبگار ہیں۔ وہ آپ کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں اور اپنی خطاؤں پر پشیمانی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ رسول اکرمؐ کی رحمت اور مہربانی سے ناامید نہیں ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ آپ روزِ قیامت تمام عاصیوں کی بخشش کا وسیلہ ثابت ہوں گے۔

کرم کی فراوانیاں اللہ اللہ، شفاعت کی ارزانیاں اللہ اللہ
خطاؤں کو پایا شکستہ شکستہ، گناہوں کو دیکھا پشیماں پشیماں

ڈھونڈے سے بھی عاصی نہ ملے روزِ قیامت
تب بات ہے اے وسعتِ دامانِ محمدؐ

قابلؔ کی نعت گوئی میں نبی کریمؐ کی مبارک دید اور مہربان یاد کی دھنک بھی موجود ہے۔ ان کے نزدیک خیالِ رسالت مآبؐ زندگی کی تیرگی میں امید کی ایک کرن ہے ــــ ایک ایسی کرن جس کے سامنے دن کے اجالے بھی ہیچ ہیں۔ قابلؔ کی نعتیہ شاعری میں ان پاک شہروں کا ذکر بھی ملتا ہے، جن میں حضور اکرمؐ کا قیام رہا۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ سوچ کے طیبہ کی طرف کرتا ہوں سجدے
اللہ کا ایوان ہے ایوانِ محمدؐ

وہیں تجھ کو آرام آئے گا قابلؔ، وہیں پا سکیں گے سکوں دیدہ و دل
مدینے کی شامیں چراغاں چراغاں، مدینے کی صبحیں بہاراں بہاراں

فنی اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ قابلؔ کی دونوں نعتیں غزل کی ہیئت میں ہیں۔ایک نعت میں انھوں نے قافیہ میں صنعتِ تکرار کا اہتمام کیا ہے نیز یہ نعت غیر مردف ہے اوراس میں اندرونی قوافی بھی ہیں۔ مطلع دیکھیے:

جمالِ محمدؐ سے تزئینِ عالم، جمالِ محمدؐ گلستاں گلستاں
منور منور، معطر معطر، فروزاں فروزاں، درخشاں درخشاں

عید مسلمانوں کیلئے خوشی کا تہوار ہے۔ یہ روزِ سعید اہلِ اسلام کیلئے مسرت آمیز جشن کا درجہ رکھتا ہے لیکن قابلؔ خوشی کے اس موقع پر اداسی اور قنوطیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔اس میں ان کی غم پسند طبیعت کا عمل دخل ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی چند محرکات ہیں، جن کی نوعیت نفسیاتی ہے۔ قابلؔ نے تمام زندگی غربت کی کڑی دھوپ میں بسر کی۔یتیمی نے ان کے اندر احساسِ محرومی پیدا کر دیا تھا اور جب وہ اس احساس کو نظم کرتے ہیں تو ان کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔قابل کی نظم کا عنوان ہے—— ''عید کا دن (ایک غریب اور لاوارث بچے کا احساس)''۔اسی نظم میں قابلؔ نے ایک یتیم بچے کی داستان رقم کی ہے۔عیدِ قربان کے روز اس طفلِ غریب کے بدن پر صرف ایک پھٹی لنگوٹی ہے اور پیٹ میں بھوک۔یوں معلوم ہوتا ہے کہ قابلؔ نے اس نظم میں اپنی کہانی بیان کی ہے۔یہ نظم ایک افسوسناک طنزیہ پر انجام پذیر ہوئی ہے:

رشک آتا ہے مجھ کو بکرے پر
مجھ سے ان کا نصیب ہے بہتر

ان کو مہندی لگائی جاتی ہے
خوب دعوت کھلائی جاتی ہے

کیا رنگیلی ادا نکالی ہے
پھول مالا گلے میں ڈالی ہے

ان کی قیمت تو ہے، مقام تو ہے
موت کا خاصی اہتمام تو ہے

قابلؔ کی شخصیاتی انداز کی ایک نظم ''مارگریٹ سے خطاب'' بھی خاصے کی چیز ہے۔اس میں بھی قابل نے اس طرز کی دیگر نظموں کی طرح تخاطب کا رویہ اختیار کیا ہے۔وہ شہزادی مارگریٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے اسے بے حیا اور بے وفا قرار دیتے ہیں۔اس نظم کا مجموعی تاثر یہ بنتا ہے کہ مارگریٹ نے دولت کا سہارا لے کر کسی غریب کی محبت کا مذاق اڑادیا ہے۔یہ نظم ترقی پسندانہ خیالات کی عکاس ہے اور ساحر لدھیانوی کی نظم ''تاج محل'' کی یاد دلاتی ہے۔چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہاں مگر تجھکو عشق کیا ہو گا
تو ہے آغوشِ زر کی پروردہ

یہ تماشا تجھی پہ ختم نہیں
سارے سرمایہ دار کرتے ہیں

اپنی ناپاک خواہشوں کیلئے
عشق کا کاروبار کرتے ہیں

عشق ساتھی ہے ہم غریبوں کا
قصرِ شاہی میں رہ نہیں سکتا

قابلؔ کی نظم میں ترقی پسندانہ رویہ نمایاں ہے۔قابلؔ نے جس دور میں سخن گوئی کا آغاز کیا، اس وقت ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی اور شعروادب میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بیان کرنے کی روش زور پکڑ رہی تھی۔ترقی پسند شاعری میں مخصوص موضوعات کی پیشکش میں عموماً جھنجلاہٹ اور طیش آور رویہ اختیار کیا گیا تاہم معتدل اور متوازن انداز کے بعض سخن پارے بھی منظرِعام پر آئے۔اس دور کا شاعر مجازؔ استحصالی قوتوں کے خلاف غم وغصہ کا اظہار یوں کرتا ہے:

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں، اس کنارے نوچ لوں

قابلؔ خالص اشتراکی رنگ میں اس موضوع کو بیان کرتے ہیں لیکن وہ خدا کو اور اس کی حقیقت کو نہیں بھولتے۔

تمہارا ہر معاملہ خدائے دوجہاں سے ہے
خدائے میکدہ سے ساغرِ شراب چھین لو
اگر تمہاری شامِ غم کی ظلمتیں نہ مٹ سکیں
تمہارا فرض ہے فلک سے ماہتاب چھین لو
خدا شناس پر بتوں کی دوستی حرام ہے
تمام جلوہ ہائے حسنِ بے نقاب چھین لو

یہ چند اشعار قابلؔ کی نظم ''سحر سے نور چھین لو'' سے لیے گئے ہیں جو غزل کی انداز میں لکھی گئی ہے۔

قابلؔ اپنی انقلابی شاعری میں مزدور کی حمایت کرتے ہوئے بے حس حاکموں کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے نظم ''تمہیں کیا'' میں اپنے انقلابی جذبات کا اظہار یوں کیا ہے:

ہوئے ہیں طربناک شب و روز تمہارے
مزدور ہے صیدِ غمِ دوراں تو تمہیں کیا

تم شام و سحر بادۂ گل رنگ سے کھیلو
مرتا ہے اگر بھوک سے دہقاں تو تمہیں کیا

اس طرز کی شاعری میں قابل نے بدعنوان حکمرانوں اور ان کی ناپاک سیاست کو بھی نشانۂ تنقید بنایا ہے اور انھیں اسلام کیلئے ایک مستقل خطرہ قرار دیا ہے:

قائم ہے ابھی گرمئی بازارِ سیاست
برباد ہوئی دولتِ ایماں تو تمہیں کیا
تم کو ہوسِ جاہ سے فرصت ہی کہاں ہے
خطرے میں ہے ناموسِ مسلماں تو تمہیں کیا

قابلؔ ملک میں انقلاب اور زندگی میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ان کی آرزو تھی کہ یہ فرسودہ طرزِ حیات اور نظامِ زمانہ تبدیل ہو جائے۔اقبال کی طرح انھیں بھی نوجوانوں سے بہت توقعات وابستہ تھیں۔ان کے خیال میں صرف نوجوان ہی نظام میں تبدیلی لا سکتے ہیں۔

حکومت کے جوہر، ہنر کے خزینے
تمدن کی شمعیں، ترقی کے زینے
یہ مغرب زدہ زندگی کے قرینے
بصد قدرتِ ناقدانہ بدل دو
جوانو، نظامِ زمانہ بدل دو

یہ بند قابلؔ کی نظم ''نظامِ زمانہ بدل دو'' سے ہے جو مخمس کی ہیئت میں ہے۔قابلؔ انقلابی طرز کی شاعری میں اسلامی اصولوں اور اخلاقی قدروں کو پامال نہیں ہونے دیتے بلکہ ان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

قابلؔ اپنے ہمعصر شاعروں سے بھی متاثر تھے۔قابل کی نظم ''کیا کروں'' کی ٹیپ کا مصرع اسرار الحق مجاز کی نظم ''آوارہ'' کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔قابل نے مربع ہیئت میں لکھی گئی نظم میں ٹیپ کا مصرع مجاز کی نظم ''آوارہ'' سے لیا ہے۔مصرع یہ ہے۔

ع اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

''کلیاتِ قابل'' میں تین گیت بھی شامل ہیں۔ان گیتوں پر حفیظ جالندھری کے اثرات ہیں۔گیتوں میں اندرونی قوافی کے اہتمام سے موسیقیت اور ترنم کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔

شبنم کے موتی نکھرے، پھولوں کے جام چھلکے
اک حسن جلوہ گر ہے منظر بدل بدل کے
اللہ رے خودنمائی
صبح بہار آئی

قابل نے قطعہ نویسی بھی کی۔ ان میں صحافتی طرز کے قطعے بھی شامل ہیں اور خالصتاً رومانوی انداز کے نمونے بھی ہیں۔ صحافتی قطعات وقتی اور ہنگامی نوعیت کے ہیں۔ ان میں ظرافت کی ہلکی سی آمیزش بھی شامل ہے مثلاً:

اس کو کہتے ہیں مقدر، جسم کی تکلیف نے
عاشقِ خستہ کے دردِ دل کا درماں کر دیا
یعنی جو ناقابلِ پرسش تھا بزمِ ناز میں
آج خارش نے اسے سب سے نمایاں کر دیا
(عنوان: خارش)

قابل نے رومانوی طرز کے قطعات بھی تحریر کیے۔ ایسے قطعات میں تغزل کا رنگ جھلکتا ہے۔ نمونہ دیکھیے:

لب و عارض کے پھول کھلتے ہیں
گیسوؤں کی ہوا بھی آتی ہے
شامِ غم کے سکوت میں اکثر
اس کی آوازِ پا بھی آتی ہے

ہم دیکھتے ہیں کہ قابل کے بنیادی موضوعات چند ایک ہی ہیں۔ وہ مختلف اصناف میں اپنے مخصوص موضوعات کو بار بار پیش کرتے ہیں۔ ان موضوعات میں خاص طور پر عید، انقلاب، شخصیات، آزادی اور وطنیت اہم ہیں۔ اپنے خیالات اور جذبات کو نظمانے میں وہ ایک حد تک

کامیاب ہوئے ہیں لیکن ''چند آنچوں'' کی کمی بہر حال محسوس ہوتی ہے۔ قابل بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ اس لیے ''نظم'' کہتے ہوئے وہ غزل کے اسلوب سے دامن کش نہ ہو سکے۔ ان کی نظموں میں متعدد اشعار ایسے ملتے ہیں، جن میں تغزل کا حسن موجود ہے۔ ایسے شعر اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ قابل کی تخلیقی صلاحیت کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ مزید کچھ عرصہ حیات رہتے تو غزل کی طرح نظم کی صنف پر بھی عبور حاصل کر لیتے تاہم قابل کے کلام میں چند ایسی نظمیں ضرور ملتی ہیں، جو قابلِ توجہ ہیں۔ یہ نظمیں موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر ایک وحدت کی صورت میں ہیں، لیکن قابل کی اکثر نظمیں اس خوبی سے عاری ہیں۔ دراصل قابل غزل کے شاعر تھے۔ انھوں نے صرف اس دور کے شعری مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے نظم نگاری کی، لیکن اس میدان میں وہ اس انداز سے کامیاب نہ ہو سکے، جو ان کی غزل سے منسوب ہے۔

قابل اجمیری کی قومی شاعری:

وطن سے محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے۔ اہلِ دل کے لیے حب وطن، ملکِ سلیمان سے خوشتر ہے۔ چنانچہ وطن سے محبت کرنے والے اپنے اپنے انداز میں لیلائے وطن کے گیسو سنوارا ہی کرتے ہیں۔ ایک محبِ وطن شاعر کی حیثیت سے قابل اجمیری نے بھی اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا جذبہ حب الوطنی دراصل ایک سچے تجربے کی بنیاد پر قائم ہے۔ قابل نے تحریکِ پاکستان کا زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس تحریک کے دوران میں کشت و خون کا جو بازار گرم ہوا، وہ ہماری تاریخ کا ایک افسوس ناک باب ہے۔ قابل نے اس خونی المیے کو ایک حساس شاعر کی حیثیت سے قبول کیا اور پھر اپنے احساسات و جذبات کو نظم کے قالب میں ڈھال دیا۔ انھوں نے غزل کے آہنگ میں اس انقلاب کو ایمائی پیرائے میں بیان کیا ہے، تاہم نظم کہتے ہوئے وہ واشگاف انداز اختیار کرتے ہیں۔ قابل نے قیامِ پاکستان کی تحریک کا ایک سیاسی ناقد کی حیثیت سے تجزیہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک اس تحریک کا اصل آغاز ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی سے ہو چکا تھا۔ اس تحریک کا دورانیہ کم و بیش سو برسوں پر محیط ہے۔ غزل کا شعر ملاحظہ ہو:

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

غزل کے اس شعر میں انھوں نے رمز و علامت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ تاہم نظم میں وہ واضح الفاظ میں جنگِ آزادی کا جائزہ لیتے ہیں۔ ''کلیاتِ قابل'' سے ان کی نظم ''نقشِ حیات'' (۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی یاد میں) سے چیدہ چیدہ اشعار درج کیے جا رہے ہیں:

پچھلے سو سال کے اندھیروں کو
حادثے آئینہ دکھاتے ہیں
خون بہتا ہے جب جوانوں کا
رنگِ ہستی نکھر ہی جاتا ہے
جو رگِ حریت سے ٹپکا ہو
وہ لہو رائیگاں نہیں جاتا
جب ارادہ جوان ہوتا ہے
حادثے راہ بھول جاتے ہیں

قابل نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب کوئی قوم انقلاب پر آمادہ ہو جائے اور سردھڑ کی بازی لگانے سے گریز نہ کرے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ آزادی کی دیوی اس قوم پر مہربان نہ ہو۔ برصغیر کے مسلمانوں کو بھی ایک طویل اور صبر آزما تحریک کے بعد آزادی کی نعمت حاصل ہوئی اور دنیا کے نقشے پر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک آزاد اسلامی مملکت کا قیام عمل میں آیا۔ قابل اجمیری نے ایک نظم ''۱۴ اگست'' میں اس تاریخی دن کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

اس ایک دن میں ہیں ماضی کی وسعتیں رقصاں
اس ایک پھول میں فردوسِ حال جلوہ فروش
اس ایک جام میں فردا کا حسن بے پایاں

آگے چل کر قابل ایک فرد کی حیثیت سے پوری ملت کو جوشِ عمل سے حاصل ہونے والی کامیابی پر مبارک باد کہتے ہیں اور اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ قوم کو یہ آزادی ذوقِ عمل اور ذوقِ یقین سے نصیب ہوئی ہے۔ نظم کا انجام ان الفاظ پر ہوتا ہے:

ہم آج شہرِ تمنا کے شاہزادے ہیں
ہمارے ہاتھ سجاتے ہیں محفلِ فردا
ہمارے ہاتھ نہیں وقت کے ارادے ہیں

عید کا تہوار، قابل اجمیری کی شعر گوئی کے لیے ہمیشہ تشویق اور تحریک کا باعث رہا ہے اور عام طور پر وہ عید کے پُرمسرت موقع کو ایک اداس اور آزردہ رہنے والے شاعر کے طور پر نظم کرتے ہیں۔ تاہم انھوں نے اس موضوع کو وطنیت سے مربوط اور ہم آہنگ بھی کیا ہے۔ وہ عیدِ قربان کے دن حسینۂ وطن سے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ اس کے تحفظ کی خاطر جان کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ انھوں نے اپنی نظم ''ایک عید ایک عہد'' میں وطن سے وفاداری کا اظہار یوں کیا ہے:

آج سارے حجاب اٹھنے دو
دل فگاروں کی عید آئی ہے
آج کا جشن صرف جشن نہیں
زندگی کا شعور دیتا ہے
ہم بھی اے ارضِ پاک تیری قسم
تجھ کو گردوں شکار کر دیں گے
تیری عظمت، تری بقا کے لیے
اپنی جانیں نثار کر دیں گے

قابل اجمیری لیلائے وطن کی زلفوں کے اسیر تھے۔ وطن، ان کے لیے محض ایک خطۂ ارضی کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ان کے لیے ایک خواب کی تعبیر ہے۔ وطن، ان کے لیے نظریے کا نام ہے، قوم مذہب اور ایمان کا عنوان ہے۔ وطن سے محبت کا جذبہ متعدد جگہوں پر ان کی نظموں میں بیان ہوا

ہے۔ ان کی نظم ''مرے محبوب وطن'' وطن پرستی کی آئینہ دار ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ نظم مربع صورت میں ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

صبحِ تازہ نے بدل ڈالا بہاروں کا چلن
آ کے ٹھہرا ہے نیا قافلۂ سرو سمن
دیکھ وہ ناچ رہی ہے، نئے سورج کی کرن
اے مرے پاک وطن، اے مرے محبوب وطن

اس طرح قابل کی شاعری میں وطن دوستی کے حوالے سے ایک نغمہ بھی ملتا ہے۔ نغمے کے چند بول سنیے:

محفل محفل جشنِ طرب ہے
گلشن گلشن نغمہ بلب ہے
صحرا صحرا شوقِ طلب ہے
دریا دریا اک طوفان
جاگ رہا ہے پاکستان

قابل اجمیری نے جہاں وطن کی محبت گیت گائے ہیں، وہاں انھوں نے اپنے ملک کے عظیم راہنماؤں کی شان میں قصیدے بھی تحریر کیے ہیں۔ قابل نے پاکستانی تاریخ کے اہم ترین سیاسی راہنما قائداعظم محمد علی جناح کو شعر کی زبان میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی نظم ''قائداعظم'' میں اس عظیم شخصیت کی سیاسی بصیرت اور قومی خدمات کو سراہا ہے۔ نظم میں قائداعظم کے افکار اور نظریات کو تغزل کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ چند شعر دیکھیے:

یقین محکم و تنظیم و اتحاد کے ساتھ
حقیر قطروں کو طوفاں بنا دیا تو نے
چھڑا کے قیدِ غلامی سے ناتوانوں کو

دلیلِ عظمتِ انساں بنا دیا تو نے
جہاں کلی کو اجازت نہ تھی چٹخنے کی
اسی زمیں کو گلستاں بنا دیا تو نے

غزل کی ہیئت میں لکھی گئی اس نظم میں قابل نے قائداعظم کی اصول پرستی اور قیادت پر ناز کیا ہے اور قائد سے تخاطب کے انداز میں کہا ہے کہ انھوں نے فکر ونظر کے پیمانے بدل کر رکھ دیئے اور جنوں کو ہوش بداماں بنا دیا۔ قابل کے نزدیک یہ قائد کا فیضانِ نظر تھا کہ پوری ملت حریفِ گردشِ دوراں بن گئی اور بالآخر قوم نے ایک جداگانہ خطہ حاصل کرلیا۔

قابل اجمیری نے اپنی شاعری میں علامہ اقبال کی شاعرانہ ومفکرانہ حیثیت کی بھی توصیف و تحسین کی ہے۔ ان کی شاعری پر اقبال کے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

قابل اجمیری برصغیر کی سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ تخلیقی صلاحیت کے ساتھ سیاسی بصیرت کے حامل بھی تھے۔ چنانچہ جب وہ سیاسی موضوعات کو شعر کے روپ میں بیان کرتے ہیں تو ان کے اسلوب میں ایک خاص طرز کی دلکشی اور معنی خیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں قابل اجمیری کی ایک نظم جو شخصیاتی رنگ میں ہے، خاصی اہم ہے۔ نظم کا عنوان ''پنڈت نہرو کے نام، آدمیت کا پیغام'' ہے۔ اس نظم میں قابل نے پنڈت جی سے مخاطب ہوتے ہوئے ان کی دوغلی سیاست کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ قابل نے پنڈت نہرو کے ''قومی وحدت'' کے تصور کو بڑی شدومد سے جھٹلایا ہے۔ نہرو نے امن اور اخوت کے جھوٹے نعرے لگائے تھے، قابل اس سیاسی چال پر طنز کرتے ہیں۔ اس طویل نظم میں جو مسدس کی ہیئت میں ہے، قابل ایک سیاسی دانشور کی شکل میں سامنے آئے ہیں۔

قومیت کے زندگی افروز نغمے کیا ہوئے
ہندو مسلم بھائی بھائی کے وہ نعرے کیا ہوئے
اتصالِ کفر و ایماں کے سلیقے کیا ہوئے
کیا ہوئے وہ وحدتِ قومی کے دعوے کیا ہوئے

آ گرہ، اجمیر اور دہلی کے خونیں حادثات
زرد ہے روئے تمدن سرد ہے نبضِ حیات [۳]

قابل نے یہ نظم قیامِ پاکستان کے فوراً بعد تحریر کی۔ اس لیے اس میں جذباتیت کی لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔ یہاں اس دور کی سیاسی صورتِ حال کا نقشہ بھی چابکدستی اور ہنرمندی سے پیش کیا گیا ہے۔ قابل نے علاقائی اور جغرافیائی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے، ہندو قوم کے جبر وتشدد اور استبداد پر کڑی تنقید کی ہے۔ انھوں نے آ گرہ، اجمیر، دہلی، کشمیر، دکن اور جونا گڑھ کے شہروں میں ہونے والے خونی فسادات کا تذکرہ بھی کیا ہے اور ان شہروں میں ہندوؤں کی لشکر کشی، غاصبانہ کارروائی اور جابرانہ دھاندلی کو دنیائے عالم کے آگے بے نقاب کیا ہے۔

قابل اجمیری کی نظمیں جذبۂ حریت اور سیاسی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔ قابل کی نظمیں ان کے ملی شعور اور قومی طرزِ احساس نمائندگی کرتی ہیں۔ قابل کی وطن سے محبت مسلمہ ہے اور وہ اپنی شاعری کے ذریعے اہلِ وطن کو بھی یہی ''پیغامِ محبت'' دیتے ہیں۔

اقبال کے اثرات:

گلزار کے پھولوں کی مہک ہے اقبال
آ کاش کے تاروں کی چمک ہے اقبال
جاگو ارے ملت کے جوانو جاگو
اسلام کے ساغر کی کھنک ہے اقبال

علامہ اقبال کو یوں منظوم خراجِ تحسین پیش کرنے والے شاعر قابل اجمیری ہے۔ قابل اجمیری نے اقبال کے زمانۂ حیات میں جنم لیا اور اس وقت کے بعض دیگر شاعروں مثلاً اسد ملتانی، امین حزیں، آغا صادق، شہید ابنِ علی، ایوب صاحب اور عاصی کرنالی کی طرح وہ بھی اقبال کے افکار اور اشعار سے براہِ راست متاثر ہوئے۔ قابل اجمیری کی اولین حیثیت ایک غزل گو کی ہے۔ تاہم انھوں نے نظم نگاری بھی کی ہے اور ان کی نظموں میں ہی اقبال کے ہمہ گیر اثرات واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں۔

قابل اجمیری علامہ اقبال سے فکری اور نظریاتی سطح پر بہت متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں اسلامی طرزِ احساس غالب نظر آتا ہے۔ اقبال نے ایک وسیع افق سے اسلامی نشاتِ ثانیہ کا ذکر کیا ہے۔ قابل محدود پیمانے پر اقبال کی نیاز مندانہ تقلید کرتے ہوئے اس موضوع کو شاعری میں جگہ دیتے ہیں، تاہم یہ تقلید برائے تقلید نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں ایک مذہبی انسان کا ذہن بھی کارفرما ہے۔ اقبال کی شاعری میں مسلمانوں کے عظیم ماضی کی یاد آفرینی، انحطاط کے اسباب اور رجائیت کا پیغام ملتا ہے۔ قابل ایک محدود دائرے میں ان موضوعات کو بیان کرتے ہیں۔

قابل ایک درد مند مسلمان کا دل رکھتے تھے۔ انھوں نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ مسلمانوں کی زبوں حالی کا زمانہ تھا۔ قیام پاکستان کی تحریک زوروں پر تھی۔ برصغیر میں اہلِ اسلام سیاسی، سماجی اور معاشرتی سطح پر جبریت کا شکار تھے۔ اس انحطاط کا ایک اہم سبب مسلمانوں کی بے عملی اور بے حسی تھی۔ قابل ایک طرف مسلمانوں کو عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتے ہیں تو دوسری جانب انقلاب کے گیت گاتے ہیں۔ قابل جب اس موضوع کو نظم کرتے ہیں تو اقبال کی پیروی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال کے پیشِ نظر مکمل اسلامی تاریخ تھی لیکن قابل برصغیر کی صد سالہ تاریخ کو سامنے رکھتے ہیں، تاہم وہ تلمیحات کو ماضی بعید کی روشنی میں ترتیب دیتے ہیں۔ قابل کی نظموں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر سمت ایک معرکۂ کربلا ہے گرم
کوئی غلام شاہ شہیداں کب آئے گا
انسان کو رہا ہے خدا سے بغاوتیں
فاروقِ عصر و فاتحِ دوراں کب آئے گا

اس طرز کی شاعری میں قابل کے اسلوب پر اقبال کی نمایاں چھاپ نظر آتی ہے۔ ان کی لفظیات پر بھی اقبال کے اثرات ہیں۔ ذیل میں وہ تلمیحات و تراکیب دی جا رہی ہیں جو اقبال کی یاد دلاتی ہیں:

برقِ یزدانی، عمامہ نشیں، پنجۂ امروز، تابِ قیصری، عصائے موسوی، اسوۂ پیغمبری، سجادہ پرستی، محرمِ یزداں، یوسف، فرعون، موسیٰ، دیو استبداد، فرعونیت وغیرہ۔

''کلیاتِ قابل'' میں ایک نظم ''دریائے نیل'' بھی شامل ہے، اس نظم کا آہنگ اور اسلوب کہیں کہیں اقبال کی نظم ''مسجدِ قرطبہ'' کی طرز کا ہے۔ نظم کا آغاز ہی اس جانب واضح اشارہ کرتا ہے:

نیل اے تہذیبِ اقوامِ کہن کے راز دار
اے امینِ روز و شب اے حال و ماضی در کنار
قسمت فرعون و موسیٰ کی مکمل یادگار
تو نے دیکھے ہیں زمانے کے حوادث بے شمار
کائنات حق و باطل کی حد فاصل ہے تو
حق پرستوں کے لیے دریا نہیں ساحل ہے تو

قابل کی ایک نظم ''سجادہ و عمامہ پرست مسلمان سے'' ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر اقبال کے خانقاہی نظام کے حوالے سے خیالات کی یاد آتی ہے۔ اس نظم میں قابل نے عمامہ پرست مسلمانوں کے نظریات اور اعمال پر تنقید کی ہے اور انھیں ''سجادہ پرستی'' کے بجائے ''سجادہ گری'' سیکھنے کی تلقین کی ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی نجات صرف اسوۂ رسول کریم ﷺ کی پیروی میں ہے۔

نغمہ زن ہو بربطِ احساسِ خفتہ پر ذرا
چاہیے امت کو کسبِ اسوۂ پیغمبری

اقبال کی طرح قابل نے بھی عید کے اسلامی تہوار کو شاعری کا موضوع بنایا ہے لیکن وہ اس موضوع کو ایک اشتراکی شاعر کی نظر سے دیکھتے ہیں اور سرمایہ دار نظام کو ہدفِ ملامت بناتے ہوئے مزدور کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ ''ہلالِ عید سے چند اشارے'' کے زیرِ عنوان چاند سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

عارضی پھولوں سے ہے بزمِ جہاں مہکی ہوئی
آرزوئے سیم و زر میں مفلسی بہکی ہوئی

کون دیکھے گا تری تنویرِ دل افروز کو
آتش سرمایہ داری ہے یہاں دہکی ہوئی
دور دورہ ناامیدی کا ہے دنیا بھر میں آج
اے ہلالِ عید کس امید پر آیا ہے تو

اس آخری شعر سے توجہ اقبال کی ایک نظم کے آخری شعر کی جانب مبذول ہوتی ہے۔اقبال کی نظم کا عنوان ''عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں'' ہے۔ یہاں اقبال بھی ناامیدی اور اداسی کا شکار دکھائی دیتے ہیں اور آخر میں یہ حزینہ کیفیت عروج پر پہنچ جاتی ہے۔اقبال کا شعر دیکھیں:

پیامِ عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

قابل اس مایوس رویے کا رومانی طرز میں بھی اظہار کرتے ہیں اور محبوب کی بے نیازی کے دوران میں آنے والی عید کو محرم سے تعبیر کرتے ہیں:

میرے محبوب تری شانِ مروت کے نثار
آج تو دردِ محبت کا مداوا دیدے
کیا ترے پاس کوئی عید کی سوغات نہیں

علامہ اقبال کی شخصیت کی بہت سی جہتیں ہیں۔وہ شاعر بھی تھے اور فلسفی بھی، مفکر بھی تھے اور ایک مدبر سیاستدان بھی۔قابل اجمیری، اس عظیم شخصیت کی شاعرانہ حیثیت اور علمی و سیاسی مرتبے کے قائل تھے۔قابل شاعری کی سطح پر اقبال کے افکار، خیالات اور اسلوب سے خاصے متاثر تھے۔ ان کی نظمیہ شاعری میں اقبال کے نقوش واضح طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔قابل نے اپنی نظمیہ شاعری میں مختلف مقامات پر اقبال کی مدح بیان کی ہے۔ایک نظم بعنوان ''اقبال'' میں انھوں نے اقبال کو ایک ایسا دیدہ ور قرار دیا جس نے ذروں کو آفتابِ درخشاں بنا دیا۔ان کے نزدیک اقبال ایک

ایسے چارہ ساز ہیں جنھوں نے ہر درد کو ضمانتِ درماں کا روپ دے دیا۔ غزل کی ہیئت میں تحریر کردہ اس نظم کے چند اشعار دیکھیں:

وہ فلسفی جو اپنی خودی کی تلاش میں
ارباب دل کو محرمِ یزداں بنا گیا
وہ باغبان جو اپنی نسیمِ خیال سے
شامِ چمن کو صبحِ بہاراں بنا گیا
وہ دلربا کہ جس نے بدل دی سرشت دل
تکلیف کو نشاط کا ساماں بنا گیا

قابل نے رباعی جیسی صنف سخن میں بھی اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں اقبال کو نبی کریم ﷺ کے پیامبر ہونے کا شرف حاصل ہے کیونکہ وہ قرآنی تعلیمات کو اردو زبان میں بیان کرتے ہیں، اس لیے ان کا ہر شعر ایک تحریک کا درجہ رکھتا ہے۔ اقبال کے شاعرانہ افکار پر عمل کرنے سے مسلمان کردار کے غازی بن سکتے ہیں اور یوں دنیا پر حکومت کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ ذیل میں قابل کی دو رباعیاں درج کی جارہی ہیں:

دنیا میں ابھی نقش جمانا ہے تجھے
گفتار کو کردار میں لانا ہے تجھے
اقبال کے اشعار کو پڑھنے والے
ہر شعر کو تحریک بنانا ہے تجھے

آدم کی نگاہوں کی نمی ہے اقبال
اللہ کے ہونٹوں کی ہنسی ہے اقبال
قرآن کو اردو میں سناتا ہے ہمیں
پیغمبرِ سرکارِ نبیؐ ہے اقبال

غیاث الدین قریشی نے قابل کے رنگِ سخن کے اس پہلو کی جانب یوں اشارہ کیا ہے:

''ان کی کچھ نظمیں واضح طور پر انقلابی یا شخصیاتی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ ''قائداعظم'' اور ''علامہ اقبال'' پر ان کے اشعار عقیدت کے جذبات سے لبریز ہیں۔ ان اشعار میں تغزل برائے انقلاب کی کیفیت ہے جبکہ ان کے بیشتر اشعار میں تغزل برائے تغزل کا رنگ پایا جاتا ہے۔''[۴۴]

قابل اجمیری نے کہیں کہیں طرزِ اقبال میں ریختہ کہنے کی کوشش بھی کی ہے۔ غزل میں وہ ایک طرف اقبال کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں اور دوسری جانب ان کی نیازمندانہ پیروی کرنے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ یہاں قابل کی ایک غزل کا تذکرہ ضروری ہے جو موضوعاتی واسلوبیاتی سطح پر اقبال کی تقلید کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ طوالت کے خوف سے صرف دو شعر پیش کیے جارہے ہیں:

اس قوم کی تہذیب کا معلوم ہے انجام
جس قوم کی تہذیب میں داخل ہو زن و جام
فقدانِ خودی ہو تو ہر اک سانس ہے الزام
عرفانِ خودی ہو تو ہر اک سانس ہے انعام

یہ غزل مکمل طور پر اقبال ہی کی لفظیات کے زیر اثر ہے۔ ذیل میں اس غزل کے وہ الفاظ و تراکیب دی جارہی ہیں جو اقبال کے رنگ میں ہیں:

فقدانِ خودی، عرفانِ خودی، مشرق، الہام، مسلمان، کفر، ایمان، براہیم، بانگِ درا، ملتِ بیضا، وغیرہ۔ اسی طرح قابل نے کہا تھا:

اپنے جلووں کو بقدر دلِ شیدا کر دے
یا مجھے وسعتِ دامانِ تمنا کر دے

تو یہ غزل بھی اقبال کی زمین میں ہے یعنی:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے

قابل اجمیری ایک جواں مرگ شاعر تھے۔ اگر زندگی کچھ اور وفا کرتی تو زیادہ پختہ شعور کے

ساتھ اقبال کے افکار اور تعلیمات کو شعر کی زبان میں بیان کرتے۔ بہرحال اقبال کے ایک سچے عاشق کے طور پر قابل اجمیری کی شاعری قابل توجہ ہے۔

حوالے:

۱۔ کریم الدین احمد ''قابل کی شعری دنیا'' طالب علم ڈائجسٹ (قابل نمبر) ص ۳۸
۲۔ کریم الدین احمد، طالب علم ڈائجسٹ، ص ۳۸
۳۔ قابل اجمیری، روزنامہ شاہین، حیدرآباد، ۳ جنوری ۱۹۴۹
۴۔ غیاث الدین قریشی، طالب علم ڈائجسٹ، ص ۶۰

○

غیر مدون کلام

انقلاب

ظلمتِ شب سے خجل نورِ سحر حُسن عالم تاب محصورِ نقاب
دھندلا دھندلا سا ستاروں میں قمر خاکسار کے ذروں میں گم ہے آفتاب
انقلاب اللہ اکبر انقلاب

اہل وحشت مائل عیش و نشاط ماہرین علم و دین خوار و خراب
جانور کو جانور سے ارتباط آدمی کو آدمی سے اجتناب
انقلاب اللہ اکبر انقلاب

بزمِ زنداں سے خُم و مے برطرف عابدوں کو حسرتِ جام شراب
مطربانِ خوشنوا خنجر بکف غازیوں کے ہاتھ میں چنگ و رباب
انقلاب اللہ اکبر انقلاب

ساقی و مے خوار کی تقدیر میں صرف ایک ٹوٹا ہوا جامِ شراب
واعظ دیندار کی تقدیر میں نوبنو دوشیزۂ تازہ شباب
انقلاب اللہ اکبر انقلاب

گربۂ لاغر کا شیر نرشکار مارو عقرب پر ہے گرگٹ فتحیاب
بوم سے آنکھیں چراتے ہیں ہزار زاغ سے کرنے لگے شاہین حجاب
انقلاب اللہ اکبر انقلاب

پشۂ ناچیز بردوش ہما مورِ کم مایہ سلیماں در رکاب
بوز نہ پہچانے ادرک کا مزا دیکھے بھونرا خوشنما تتلی کے خواب
انقلاب اللہ اکبر انقلاب

روزنامہ ترجمان حیدرآباد
۲۴ فروری ۱۹۴۹ء

اللہ رے کس اوج پہ ہے شانِ محمدؐ

اللہ رے کس اوج پہ ہے شانِ محمد خود شاہد مطلق ہے ثنا خوان محمد
ہاں یاد ہے وہ بخت کی گھتی کا سلجھنا دیکھی تھی کہیں زلفِ پریشانِ محمد
اس واسطے ہر شئے سے بچاتا ہوں نظر کو دیکھوں گا اسی سے رخ تابانِ محمد
یہ سوچ کے طیبہ کی طرف کرتا ہوں سجدے اللہ کا ایوان ہے ایوانِ محمد
لے جاتے ہیں چن چن کے ملک باغ ارم میں ہیں کیسے حسیں خاربیابانِ محمد
دل کا یہ تقاضا ہے کہ آنکھوں کو رکھو بند پردے میں چھپا لو رخِ تابانِ محمد
ڈھونڈھے پہ بھی عاصی نہ ملے روز قیامت تب بات ہے اے وسعتِ دامانِ محمد
کیا خوف ترا گرمی خورشید قیامت ہے موجِ ہوا زلفِ پریشانِ محمد

قابل مرا ہر ناز اٹھاتا ہے وہ اللہ
جس دن سے بنا ہو میں ثنا خوانِ محمد

دبدبہ سکندری رامپور

۹ فروری ۱۹۴۵ء

ہلال عید سے چند اشارے

نفس کی آلودگی عادت سی ہو کر رہ گئی
ماندگی بیچارگی قسمت سی ہو کر رہ گئی
اے ہلالِ عید ہوتا ہے گلے ملنے سے کیا
دشمنی انسان کی فطرت سی ہو کر رہ گئی

عارضی پھولوں سے ہے بزم جہاں مہکی ہوئی
آرزوئے سیم و زر میں مفلسی بہکی ہوئی
کون دیکھے گا تیری تنویرِ دل افروز کو
آتش سرمایہ داری ہے یہاں دہکی ہوئی

یہ گلستاں کی فضائیں اور یہ ہر شے کا نکھار
ٹپکے پڑتا ہے در و دیوار سے حسنِ بہار
سال میں اک روز کر کے زیبِ تن ملبوسِ نو
تجھکو بھی دیتے ہیں دھوکا عصرِ نو کے دیندار

دہریت کی مادی دنیا پہ کیوں چھایا ہے تو
منکروں کے واسطے اب کیا خبر لایا ہے تو
دور دورہ ناامیدی کا ہے دنیا بھر میں آج
اے ہلالِ عید کس امید پر آیا ہے تو

روزنامہ طوفان حیدرآباد

۱۷ جولائی ۱۹۵۰ء

ہونے والے وزیراعظم سے

پاتے تو ہو وزارتِ عظمیٰ کا مرتبہ
لیکن کہیں حضور بھی پچھلا سبق نہ دیں
چھینٹوں سے ذاتیات کے دامن بچا کے آپ
بہتر یہی ہے اپنے فرائض ادا کریں

روزنامہ ترجمان حیدرآباد

۱۷ فروری ۱۹۴۹ء

عید کے دن

(ایک غریب اور لاوارث بچے کا احساس)

سب گلے مل رہے ہیں عید کے دن
زخمِ دل سِل رہے ہیں، عید کے دن

سارے بچے نئے لباس میں ہیں
میرے ارماں ہجومِ یاس میں ہیں

مجھ سے بیگانہ ہو گئے ماں باپ
جا کے قبروں میں سو گئے ماں باپ

مشفق و مہرباں کوئی نہیں
ہمدم و ہم زباں کوئی نہیں

گرم سڑکوں پہ پھر رہا ہوں میں
جیسے پستی میں گر رہا ہوں میں

پیٹ میں دودھ ہے نہ روٹی ہے
جسم پر اک پھٹی لنگوٹی ہے

زندگی اک وبال ہے میری
موت بھی پائمال ہے میری

رشک آتا ہے مجھ کو بکروں پر
مجھ سے ان کا نصیب ہے بہتر

اُن کو مہندی لگائی جاتی ہے
خوب دعوت کھلائی جاتی ہے

کیا رنگیلی ادا نکالی ہے
پھول مالا گلے میں ڈالی ہے

اُن کی قیمت تو ہے مقام تو ہے
موت کا خاص اہتمام تو ہے

خالد۔ حیدرآباد

جولائی اگست ۱۹۵۵ء

عید کی سوغات

کوئی شائستہ وحشت نہ کوئی اہلِ نظر وسعتِ چاک گریباں کی نمائش کبتک
شام رنجور کا سینہ ہے ستاروں کی لحد داغ ہائے دلِ ویراں کی نمائش کبتک
زیست کے آئینہ خانے تو ہیں دھندلائے ہوئے جلوۂ حسنِ فروزاں کی نمائش کبتک
صرف ہونٹوں کا تبسم تو نئی بات نہیں

ان سویروں کے لیے ہم نے بجھائے تھے چراغ ان سویروں پہ تو راتوں کا گماں ہوتا ہے
عید کا جشن ترے ساتھ مناؤں کیونکر! دل پہ احساسِ مسرت بھی گراں ہوتا ہے
میرے دن رات گزر جاتے ہیں روتے روتے میری دنیا میں محرم کا گماں ہوتا ہے
کیا ترے دستِ اثر میں مرے دن رات نہیں

میرے محبوب! تری شان مروت کے نثار آج تو دردِ محبت کا مداوا دیدے
میری آہوں کو چراغِ رہِ منزل کر دے میرے نغموں کو گدازِ غمِ فردا دیدے
بات کرنے کو ترستے ہیں خیالوں کے صنم اب انھیں حوصلۂ عرضِ تمنا دیدے
کیا ترے پاس کوئی عید کی سوغات نہیں

ہفت روزہ مینائی عید نمبر، حیدرآباد
۱۰ اپریل ۱۹۵۹ء

پنڈت نہرو کے نام!

آدمیت کا پیغام

اے وزیر ہند، اے ہندو سیاست کے امام
نیک سیرت، نیک صورت، نیک طینت، نیک نام
زندہ دل، بالغ نظر، سادہ روش، رنگیں کلام
آدمیت آج دینا چاہتی ہے کچھ پیام

آدمیت کی حفاظت کے لیے اٹھے تھے آپ
یا فروغِ قتل و غارت کے لیے اٹھے تھے آپ

قومیت کے زندگی افروز نغمے کیا ہوئے
ہندو مسلم بھائی بھائی کے وہ نعرے کیا ہوئے
اتصالِ کفر و ایماں کے سلیقے کیا ہوئے
کیا ہوئے وہ وحدتِ قومی کے دعوے کیا ہوئے

آگرہ اجمیر اور دہلی کے خونیں حادثات
زرد ہے روئے تمدن سرد ہے نبضِ حیات

ہند میں آخر قیامِ امن کی کیونکر ہو آس
آپ کی ظالم وزارت کو نہیں دنیا کا پاس
اہلِ ایماں کو جہاں آئی نہ آزادی بھی راس
ایک طرف ظلم و تشدد، ایک طرف خوف و ہراس

شہر اور قصبات میں تحریکِ قتلِ عام ہے
خدمت انسانیت شاید اسی کا نام ہے

جوناگڑھ پر جارحانہ ہند کی لشکرکشی!
غاصبانہ کارروائی جابرانہ دھاندلی!
بربریت، ظلم، استبداد اور عصمت دری!
قتل و غارت، فتنہ و شر، وحشت و دیوانگی!

ہند کشتِ آدمیت کے لیے اک برق ہے
پیروانِ گاندھی و چنگیز میں کیا فرق ہے

ان حوادث کا محرک خود مسلماں ہے اگر؟
کیجئے گاندھی کے قتلِ ناروا پر اک نظر؟
کون وہ گاندھی کہ جو تھا ہندوؤں کا رہبر
مادرِ ہندوستاں کا لاڈلا لختِ جگر؟

جس نے ہندو قوم کواک زندگانی بخش دی
توڑ کر طوقِ غلامی، حکمرانی بخش دی

قوم کا سچا رفیق و مونس و ہمدم تھا کون
ذوقِ آزادی میں محوِ کاوشِ پیہم تھا کون
ساحرِ افرنگ کے اسرار کا محرم تھا کون
ہندوؤں کا ناخدا و محسنِ اعظم تھا کون

محوِ حیرت ہوں کہ غیرت بھی نہیں ہے آپ کو
تف ہے ایسی قوم پہ جو قتل کر دے باپ کو

آپ نے ارضِ دکن پر بھی بہایا ہے لہو
نوکِ شمشیر وسناں ہے اور مسلم کا گلو!
کھو چکے عثمان علی خاں آپ اپنی آبرو!
ورنہ لایعنی نہ تھی شیر دکن کی گفتگو!

ہر رضاکار اک گرجتا گونجتا طوفان تھا
دہلی و اجمیر کی تسخیرکا امکان تھا

آپ کو آزادیٔ کشمیر بھی بھاتی نہیں
ہٹلرانہ کروفر سے ہندی فوجیں بھیج دیں

لیکن ایسے غازیان صف شکن پر آفریں
جن کے دل میں ضوفگن ہے مشعلِ عزم و یقین
ہندیوں کے پاس توپیں بھی ہیں طیارے بھی ہیں
کوئی بتلائے قبائل کیا کبھی ہارے بھی ہیں

وہ قبائل خوگر عشرت نہیں جن کا شباب
وہ قبائل جو نہیں کرتے قضا سے اجتناب
وہ قبائل جن کے چہروں سے خجل ہے آفتاب
وہ قبائل جن کا ہر انداز ہے اکِ انقلاب
گلشنِ افرنگ میں طوفانِ برق و باد تھے
ہند کے عہدِ غلامی میں بھی جو آزاد تھے

وہ قبائل ہیں جو شرح آیتہ لاتقنطو
وہ قبائل جن کا ہر پیر و جواں ہے جنگجو!
وہ قبائل ہیں جو دین مصطفےٰ کی آبرو!
وہ قبائل جن کی رگ رگ میں ہے خالد کا لہو
آشنائے فقر و غربت، بے نیازِ تخت و تاج
ہیں جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف آج

آپ کو ''یو۔این۔ او'' کے حکم کا ہے انتظار
نذر خدمت میں گراں مایہ تحائف بار بار
مجلس اقوام لیکن ہے یہاں بے اختیار
جم نہیں سکتا قبائل پر کسی کا اقتدار!
ہندیوں کے خواب کی ''یو۔ این۔ او'' تعبیر ہے
مردِ مومن آپ اپنا کاتبِ تقدیر ہے

شاھین حیدرآباد، سندھ
۳ جنوری ۱۹۴۹ء

کیا تمہیں بھی وہ زمانہ یاد ہے

مجھ سے شرمانا لجانا یاد ہے چپکے چپکے دل چرانا یاد ہے
اپنا دیوانہ بنانا یاد ہے یاد کر کے بھول جانا یاد ہے
خواب میں آنا چھپائے اپنا منہ اپنے عاشق کا ستانا یاد ہے
چاندنی راتیں وہ باتیں پیار کی کیا تمہیں بھی وہ زمانا یاد ہے
دیکھنا چھپ چھپ کے مجھ کو بار بار بجلیاں دل پر گرانا یاد ہے
آنسوؤں کی منتیں ہیں نقش اول آرزوؤں کا فسانا یاد ہے
میرے جانے پر وہ چپ وہ خامشی اُف وہ اشکوں کا بہانا یاد ہے
عشق کی خاطر تری پسپائیاں منتیں کرنا منانا یاد ہے
وہ نظر وہ سوزش دل کیا ہوئی آہ وہ جلوے وہ محفل کیا ہوئی

روزنامہ وحدت دہلی
۱۸ جولائی ۱۹۴۵ء

نغمۂ غم

کوئی کمی تھی یقیناً میرے بنانے میں
جو کی ہے برق نے ترمیم آشیانے میں
تمام عمر تلافی نہ ہو سکی جس کی
کچھ ایسی ہو گئی لغزش نظر ملانے میں
نگاہ پیر مغاں کی کشش ارے توبہ
کھچ آئے اہلِ حرم بھی شراب خانے میں
میں کیسے مان لوں تیری نگاہِ قہر آگیں
شریک برق نہ تھی آشیاں جلانے میں
نگاہ والوں کا جینا محال ہو جائے
الٰہی خیر تمنا کے چار تنکوں کی
تجھ ایسے اور ہوں دو چار گر زمانے میں
ترے سکوت نے پہنچا دیا کہاں مجھکو
ہزار خطرے ہیں کافر کے مسکرانے میں
زباں بہکنے لگی حالِ دل سنانے میں
مرے ہی جوش جنوں کو نہ دیکھئے قابل
رہا ہے وہ بھی پریشاں کسی زمانے میں

ہفت روزہ ایشیا آگرہ
۲۸ اپریل ۱۹۴۵ء

موازنہ

"بیسوا" کی دوکان پر اے دوست
صرف۔ جسم حقیر بکتا ہے
اور بازار میں سیاست کے
"پیشوا" کا ضمیر بکتا ہے

روزنامہ نوائے پاکستان حیدرآباد
۲۴ مارچ ۱۹۴۹ء

قانون

اعجاز ہائے دستِ مسیحا کا وقت نے
کیا پوچھتے ہو کتنا مبارک ثمر دیا
پھانسی کا حکم دیدیا قانون نے اُسے
گاندھی کو جس نے زندۂ جاوید کر دیا

روزنامہ ترجمان حیدرآباد
۱۲فروری ۱۹۴۹ء

شاعرِلامکاں

نگاہوں میں حسرت نہ ہونٹوں پہ شکوہ
ہجوم مصائب میں بھی شادماں ہوں
مری بے کسی کا تصرف تو دیکھو
میں اس دور میں شاعرِ لامکاں ہوں

روزنامہ ترجمان حیدرآباد
۱۵مارچ ۱۹۴۹ء

دولتِ مشترکہ

بدگمانی ہے تو کیوں ربط بڑھائے کوئی
کیوں مجھے مرکز امید بنائے کوئی
میں ستمگر ہوں تو کیوں پیار جتائے کوئی
کیوں مری انجمنِ ناز میں آئے کوئی

شوق نے آپ بنایا مجھے اپنا معبود
حسنِ مغرور ہوا اہلِ جنوں کا مقصود
مجھ سے ناکامئ پیہم کا گلہ ہے بے سود
کیوں مری انجمنِ ناز میں آئے کوئی

سحر کاری نگہہ مست کی فطرت ہی سہی
برہمی کا کل شب رنگ کی عادت ہی سہی
فتنہ پردازی مرا رنگِ طبیعت ہی سہی
کیوں مری انجمنِ ناز میں آئے کوئی

درِ اقدس پہ سر شوق جھکانا ہوگا
سبز پرچم مرے پاؤں میں گرانا ہوگا
ناز بیجا بھی محبت میں اٹھانا ہوگا
کیوں مری انجمنِ ناز میں آئے کوئی

میرے اندازِ تغافل سے شکایت ہے اگر
عشقِ خوددار کو احساسِ ندامت ہے اگر
اپنی تہذیب و ثقافت سے محبت ہے اگر
کیوں مری انجمنِ ناز میں آئے کوئی

فطرتِ حسن نہیں اہل نظر سے مستور
کون کرتا ہے تمہیں عہدِ وفا پر مجبور
ذوق وحشت کی جو تضحیک نہیں ہے منظور
کیوں مری انجمنِ ناز میں آئے کوئی

روزنامہ امروز، کراچی، ۱۰ نومبر ۱۹۵۲ء / روزنامہ العصر، حیدرآباد، ۶ جون ۱۹۵۳ء

نقشِ فریادی

اُجڑی ہوئی ہیں راہیں سونے پڑے ہیں جادے خوابیدہ کاروانِ جذبات کو جگا دے
بجھتے ہوئے دلوں میں شمعِ عمل جلا دے زندہ ہوں پھر امیدیں محکم ہوں پھر ارادے
اے جانِ کفر و ایماں ایک بار مسکرا دے

صحنِ چمن میں لالہ اب خون رو رہا ہے آغوش تیرگی میں خورشید سو رہا ہے
سارا نظامِ عالم برہم سا ہو رہا ہے آوارہ گیسوؤں کو رخسار سے ہٹا دے
اے جانِ کفر و ایماں ایک بار مسکرا دے

تقدیس آدمیت بدنام ہو چکی ہے اب زندگی اسیرِ اوہام ہو چکی ہے
تحریک علم و دانش ناکام ہو چکی ہے انسان کو اب جنوں کی آغوش میں سُلا دے
اے جانِ کفر و ایماں ایک بار مسکرا دے

ڈالے ہیں ظلمتوں نے فکر و نظر پہ ڈیرے تاروں میں لے رہے ہیں انگڑائیاں اندھیرے
شب کی سیاہیوں میں محصور ہیں سویرے ماہِ تمام بن کر دنیا کو جگمگا دے
اے جانِ کفر و ایماں ایک بار مسکرا دے

احساسِ مدعا ہے نے مقصد نظر ہے تاریک منزلیں ہیں ویران رہ گزر ہے
پھر بھی کوئی مسافر آمادۂ سفر ہے اپنی تجلیوں کی اک کہکشاں بنا دے
اے جانِ کفر و ایماں ایک بار مسکرا دے

عصرِ جدید مشقِ بیداد کر رہا ہے فطرت کے گلستاں کو برباد کر رہا ہے
ہر نقشِ زندگی فریاد کر رہا ہے دامانِ آذری میں گم ہیں خلیل زادے
اے جانِ کفر و ایماں ایک بار مسکرا دے

روزنامہ ترجمان حیدرآباد

۱۵ مارچ ۱۹۴۹ء

عہد

موت کو زیست پہ خنداں نہیں ہونے دونگا
ہوس جاہ کو ایماں نہیں ہونے دونگا
کفر کو دین کا عنواں نہیں ہونے دونگا
بت کو کعبہ کا نگہباں نہیں ہونے دونگا

(۲)

تلخیٔ گردش ایام ہے منظور مگر
دل کو محرومیٔ آرام ہے منظور مگر
ہر نفس موت کا پیغام ہے منظور مگر
زہر کو درد کا درماں نہیں ہونے دونگا

(۳)

شاہد وقت کا بدلا ہوا انداز ہے آج
انجمن میں کوئی نغمہ نہ کوئی ساز ہے آج
عشق بیداریٔ جمہور کا غماز ہے آج
ماہ پاروں کو غزلخواں نہیں ہونے دونگا

(۴)

حکمرانوں کی ہوس اپنا مقدر کیوں ہو؟
عقل عیار رہ شوق میں رہبر کیوں ہو؟
ظلم کے ہاتھ میں قانون کا خنجر کیوں ہو؟
خون جمہور کو ارزاں نہیں ہونے دونگا

ڈھا کے چھوڑونگا میں رنگیں طرب خانوں کو
توڑ ڈالوں گا چھلکتے ہوئے پیمانوں کو
ہوش میں لاؤں گا افرنگ کے دیوانوں کو
زلف مشرق کو پریشاں نہیں ہونے دوں گا

(۶)

منزلِ شوق کٹھن ہے تو کوئی بات نہیں
ظلم دستورِ کہن ہے تو کوئی بات نہیں
دعوت دارورسن ہے تو کوئی بات نہیں
حق کو باطل سے پشیماں نہیں ہونے دونگا

(۷)

عرصۂ دہر میں آمادۂ پیکار ہوں میں
کوندتی برق ہوں چلتی ہوئی تلوار ہوں میں
ہاں خبردار ہوں ہوشیار ہوں بیدار ہوں میں
چند افراد کو سلطاں نہیں ہونے دونگا

(۸)

قلب میں شورش افکار رہیگی جب تک
شمع احساس شرر بار رہے گی جب تک
نطق میں طاقتِ گفتار رہے گی جب تک
ملک کو گور غریباں نہیں ہونے دونگا

روزنامہ العصر حیدرآباد

۲۸ مئی ۱۹۵۳ء

سندھ میں

یوں تو بزمیں کئی ہیں ادارے بھی
ہاں مگر صحتِ نگاہ نہیں
سب کو شہرت عزیز ہے قابل
کوئی اردو کا خیر خواہ نہیں

روزنامہ ترجمان حیدرآباد
۱۵ فروری ۱۹۴۹ء

مسٹر کھوڑو سے

ہاں آ گیا زوال وزارت پہ پیر کی
ہم جانتے ہیں اس میں تمہارا عتاب تھا
پھر آرزو وزارتِ عظمیٰ کی ہے مگر
"وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا"

روزنامہ ترجمان حیدرآباد
۸ فروری ۱۹۴۷ء

ہماری ترقی

(دو روزناموں میں ''فسانۂ عجائب'' اور ''داستانِ رنگیں'' پڑھ کر)

کوئی بتلائے ترقی کیا اسی کا نام ہے
جو نظر آتی ہے ہمکو ''جنگ'' اور ''انجام'' میں
کر دیا ثابت خیالی داستانیں چھاپ کر
ہم بھٹکتے ہیں ابھی تک وادئ اوہام میں

روزنامہ ترجمان
حیدرآباد

خارش

اس کو کہتے ہیں مقدر! جسم کی تکلیف نے
عاشقِ خستہ کے دردِ دل کا درماں کر دیا
یعنی جو ناقابلِ پرسش تھا بزمِ ناز میں
آج خارش نے اُسے سب سے نمایاں کر دیا

روزنامہ ترجمان
حیدرآباد

مارگریٹ سے خطاب

اے دیار خرد کی شہزادی
تو نے شمع وفا بجھائی ہے
تو نے انسان کو ذلیل کیا
تو نے دل کی ہنسی اڑائی ہے

دست تخلیق ہو گیا مجروح
لٹ گئی شان زندگانی کی
تو نے رسوا کیا محبت کو
تو گنہگار ہے جوانی کی

روح تہذیب آج لرزاں ہے
علم کا سرجھکا دیا تو نے
حشر برپا ہے شہر فطرت میں
کعبۂ عشق ڈھا دیا تو نے

الجھے الجھے ہیں ساز میں نغمے
شاعری کا مزاج برہم ہے
چاندنی کا طلسم ٹوٹ گیا
آبشاروں میں شور ماتم ہے

آج نکلی ہے خلد سے حوا آج مریم پہ حرف آیا ہے
آج شیریں نے پی لیا ہے زہر آج لیلیٰ نے زخم کھایا ہے

اے محبت کی قاتلہ تجھکو!
زندگی کا سفر نہ راس آئے
محفلِ رنگ و بو نصیب نہ ہو
بزمِ لعل و گہر نہ راس رائے

سلطنت کے حسین خوابوں پر تو حقیقت کو بھول بیٹھی ہے
ننگ و ناموس کی حفاظت میں عہدِ الفت کو بھول بیٹھی ہے

کس قدر دلنشیں اداؤں سے
تو نے عہدِ وفا کیا ہوگا
کتنی راتوں میں صبح فردا کا
عشق کو آسرا دیا ہوگا

جو ستارے تھے رازداں تیرے شرم سے اب عرق عرق ہوں گے
جن میں تحریر ہے فسانہ شوق وہ صحیفے ورق ورق ہوں گے

کیا اسی شوقِ ناتمام کے ساتھ
جادۂ پرخطر میں آئی تھی
کیا انھیں لڑکھڑاتے قدموں سے
عشق کی رہگزر میں آئی تھی

ہاں مگر تجھ کو عشق کیا ہوگا تو ہے آغوش زر کی پروردہ
تیری صبحیں بہار کی تخلیق تیری شامیں سحر کی پروردہ

یہ تماشہ تجھی پہ ختم نہیں سارے سرمایہ دار کرتے ہیں
اپنی ناپاک خواہشوں کے لیے عشق کا کاروبار کرتے ہیں

عشق دار و رسن میں پلتا ہے
وقت کی رو میں بہہ نہیں سکتا
عشق ساتھی ہے ہم غریبوں کا
قصر شاہی میں رہ نہیں سکتا

ماہنامہ تقدیر حیدرآباد

دسمبر ۱۹۵۵ء

○

کتابیات

کتب/رسائل/اخبارات:

سجاد بیگ مرزا، تسہیل البلاغت، دہلی: دفتر کتابت صفوۃ اللہ بیگ صوفی پبلشرز
سلیم اختر، ڈاکٹر، نفسیاتی تنقید، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء
طالب الہاشمی، مرتب، یاد رفتگاں، حصہ دوم، لاہور: حسنات اکیڈمی لمیٹڈ، س۔ن
قابل اجمیری، کلیات قابل، کراچی: فرید پبلشرز، اگست ۱۹۹۴ء
میراجی، مشرق و مغرب کے نغمے، کراچی: آج کی کتابیں، ۱۹۹۹ء
نجم الغنی، بحر الفصاحت، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء

اظہار (ماہنامہ) کراچی: اگست ۱۹۸۳ء
ساقی (ماہنامہ) کراچی: ۱۹۶۹ء
سر گزشت (ماہنامہ) کراچی: جلد ۲، شمارہ ۱۲، اکتوبر ۱۹۹۲ء
طالب علم ڈائجسٹ (ماہنامہ) حیدرآباد: جلد ۲، فروری ۱۹۷۰ء
طلوعِ افکار (ماہنامہ) کراچی: جلد ۶، شمارہ ۷، اکتوبر ۱۹۷۵ء
فردوس بالا (ماہنامہ) کراچی: نومبر ۱۹۵۰ء
نخلستان (ماہنامہ) جے پور: جلد ۷، شمارہ ۴، مارچ ۱۹۸۷ء
نئی قدریں (ماہنامہ) حیدرآباد: دسمبر ۱۹۶۲ء/ اردو شاعری نمبر، ۱۹۶۷ء

رھنما (پندرہ روزہ) حیدرآباد: جلد ۱۰، شمارہ ۱۱، ۱۷ اگست ۱۹۶۲ء

کوھسار (پندرہ روزہ) کوئٹہ: ۲۵ جون ۱۹۵۷ء

فکر و عمل (ہفت روزہ) حیدرآباد: جلد ۹، شمارہ ۳۶، ۳۰ ستمبر ۱۹۷۷ء
مینائی (ہفت روزہ) حیدرآباد: س ن

جنگ (روزنامہ) کراچی: ۱۲ فروری ۱۹۵۴ء
شاھین (روزنامہ) حیدرآباد: ۳ جنوری ۱۹۴۹ء
ھلال پاکستان (روزنامہ) حیدرآباد: ا کتوبر ۱۹۵۳ء

انٹرویو:
ظفر قابل (فرزند قابل) سے راقم کی گفتگو، سکھر: ۲۷ جنوری ۱۹۹۵ء
نرگس قابل (بیوہ قابل) سے راقم کی گفتگو، سکھر: ۲۷ جنوری ۱۹۹۵ء

○○○

روزنامہ
آفتاب
حیدرآباد سندھ
جلد ۹ | ۱۰ جون سنہ ۵۵ء | نمبر ۱۳۲

سندھ کی کابینہ نے دق کے مریض شاعر قابل کو اطالیہ بھیجنے کا فیصلہ کر لیا

کھوڑو، راشدی اور قاضی محمد اکبر کا قابل تقلید کارنامہ

کراچی ۹ جون (نمائندہ خصوصی) نہایت باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ سندھ کے نوجوان دق کے مریض شاعر قابل اجمیری کو علاج کی غرض سے اطالیہ (اٹلی) بھیجا جا رہا ہے۔ اس قابل قدر فیصلے کا سہرا مسٹر کھوڑو، قاضی اکبر اور پیر علی محمد راشدی کے سر ہے۔ مگر یہ کسی ایک وزیر کا فیصلہ نہیں بلکہ بیمار شاعر کے علاج کے لئے سندھ کی کابینہ سے عالیہ میٹنگ میں منظوری لی گئی ہے۔ کابینہ کی منظوری کے بعد حیدرآباد کے سول سرجن کو اس کی اطلاع دی گئی اور ڈائرکٹر صحت سروسز سندھ کو ضروری انتظامات کے احکام دیئے گئے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ گذشتہ مہینوں میں مسٹر قابل اجمیری کا سرکاری حکم سے حیدرآباد کے سول ہسپتال میں معائنہ ہوتا رہا ہے اور ان کی صحت سے متعلق رپورٹیں حکومت سندھ کو بھیجی جاتی رہی ہیں۔ آج سے دو ہفتے قبل حیدرآباد کے میونسپل کونسلروں اور صحافیوں نے قاضی اکبر اور پیر علی محمد راشدی سے یہ درخواست کی تھی کہ قابل صاحب کے علاج کے لئے حکومت بندوبست کرے۔ پہلے ان کو مری کے سینیٹوریم بھیجنے کی تجویز تھی مگر اب ان کو [illegible] بھیجنے کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ اس ماہ قابل اجمیری اٹلی روانہ ہو جائیں گے۔

۱۶ نومبر سنہ ۵۹ء

قابل اجمیری اب رو بصحت ہیں

ادبی حلقوں میں یہ خبر انتہائی مسرت سے سنی جائے گی کہ قابل اجمیری جو کہ چھ ماہ کے عرصہ سے تپ دق کے عارضے میں مبتلا ہیں ان کے لئے سید رضا علی صاحب مالک سندھ آئل ملز نے اسٹریپٹومائسین کے انجکشن کے پورے کورس کا انتظام فرما دیا ہے اور جناب قابل اجمیری اب رو بہ صحت ہیں۔

سند تقسیم انعامِ امتحان سالانہ بابت سنہ ۱۳۶۰ھ دار العلوم معینیہ عثمانیہ درگاہ معلی اجمیر شریف
واقعہ جلسہ سالانہ تاریخ ۱۰ رجب سنہ ۱۳۶۰ھ

نام طالب علم	کتب امتحان معہ نمبر حاصل کردہ		کل نمبر مجملہ	درجہ کامیابی	کتب انعامی مع دستخط
ابراہیم [illegible]	قرآن شریف	۹۰			اردو کی تیسری
	اردو کی تیسری	۹۵			
	املا	۱۰۰			
	دینیات	۹۰			
	حساب	۱۰۰	۴۷۵	اعلیٰ	

[illegible] دار العلوم معینیہ عثمانیہ
صدر المدرسین دار العلوم
دار العلوم

معین پریس اجمیر

جوہر قابل کی داد خود اپنی قابلیت کی دلیل ہے۔
وحیدالرحمٰن خان نے قابل اجمیری کو موضوعِ تحقیق بنا کر ایک طرف تو اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیا ہے اور دوسری طرف اس حقیقت کو روشن کیا ہے کہ سونے کو لاکھ مٹی میں ملا دیا جائے اُس کی چمک دبائے نہیں دبتی اور کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی صرّاف کی تیز بیں نگاہیں اُسے دیکھ ہی لیتی ہیں۔

جواں مرگ شاعر قابل اجمیری کے پاس "دیدۂ بیدار" تو تھا، بختِ بیدار نہ تھا۔ ہر چند کہ اُن کے نام کو اہلِ دل کے دلوں پر نقشِ دوام حاصل ہے مگر اُن کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں معلومات کم کم ہی دستیاب رہی ہیں اور نئی نسل کا تو اُن سے تعارف ہی نہیں ہو سکا۔

وحید صاحب نے نہ صرف قابل کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ اور گہرا تجزیہ پیش کیا ہے بلکہ اُن کے اہلِ خانہ سے رابطہ کر کے اُن کی نجی زندگی کے بارے میں بھی ایسی تفصیلات فراہم کی ہیں جو شاید اس سے پہلے کبھی سامنے نہیں آئیں۔

وحیدالرحمٰن کی تحقیق گو بنیادی طور پر قابل اجمیری کی قدر شناسی سے عبارت ہے تاہم انہوں نے محض مدّاحی سے کام نہیں لیا بلکہ بے لاگ معروضیت کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اُن کے پاس ایک مزاح نگار کا قلم ہے جس کی شگفتگی کی چھوٹ اُن کی سنجیدہ نگاری پر بھی پڑتی ہے چنانچہ اُن کا تحقیقی کام بھی ایسا سبک اور برجستہ اسلوب رکھتا ہے کہ قاری کی دل چسپی تسلسل کے ساتھ برقرار رہتی ہے۔

ڈاکٹر خورشید رضوی

Rs. 120
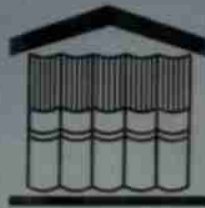
بک سٹریٹ 46-مزنگ روڈ لاہور' پاکستان فون:042-7231518-7245072

E-mail: bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com